نُقطۂ پرکارِ حیات

کا

صحیح مفہوم قرآنِ کریم کی روشنی میں

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ۵۴۶۶۰

نام کتاب	——	جہاد
مصنف	——	غلام احمد پرویزؒ
ناشر	——	طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	——	25-B گلبرگ II لاہور 54660
	——	فون 576 4484
طابع	——	دوست ایسوسی ایٹس
	——	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
	——	فون 712 2981
مطبع	——	عصمت اسلم پرنٹرز
دوسرا ایڈیشن	——	1996ء (بلا ترمیم)

طلوعِ اسلام ٹرسٹ سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جہاد، اسلام کی روح اور دین کا نقطۂ ماسکہ ہے. لیکن اس کے متعلق اس قدر غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ اصل حقیقت ان پردوں کے پیچھے چھپ گئی ہے. پرویز صاحب زندگی اور دین سے متعلق ہر مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھتے اور اس کے آئینے میں پیش کیا کرتے ہیں. یہی انداز انہوں نے اس اہم سوال (جہاد) کے متعلق اختیار کیا ہے. ان کی اس تحقیق کو آئندہ اوراق میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت طلوعِ اسلام ٹرسٹ، کو حاصل ہوئی ہے. اُمید ہے آپ اسے بصیرت افروز پائیں گے.

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات ہیں، آیات کے حوالہ میں، اوپر سورۃ کا نمبر ہوتا ہے اور نیچے آیت کا.

(مثلاً) ۲/۲۴ سے مراد ہے، سورۃ بقرہ کی چوبیسویں آیت.

والسلام   طلوعِ اسلام ٹرسٹ

۲۵، بی گلبرگ ۲. لاہور

جولائی ۱۹۶۷ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست

مضمون	صفحہ
پیش لفظ	۳
بابِ اوّل	۹
پروپیگنڈا کا فن	//
یعنی منظم جھوٹ	
یورپ کا اسلام کے خلاف جذبۂ انتقام	۱۰
انتقام کی صورت	//
عہدِ جہالت اور دورِ تہذیب میں اسلام	//
کے خلاف انتقام کی صورت۔	
ایسا پروپیگنڈا جس سے اس کی تصویر سخت	//
بھیانک نظر آنے لگی۔	
اور یہ اس اسلام کے متعلق ہے جو امن و	۱۱
سلامتی کا نظامِ حیات ہے۔	
اور فساد کے یکسر خلاف	۱۲
مسلمان کسی مذہب کے "بانی" کے خلاف	
لب کشائی تک نہیں کر سکتا۔	۱۶

مضمون	صفحہ
حتیٰ کہ ان کے باطل معبودان تک کو بھی	
گالی نہیں دے سکتا۔	
معاملات میں عدل وانصاف کی تاکید	۱۷
گواہی ہمیشہ سچی دو خواہ وہ تمہارے اپنے	//
ہی خلاف کیوں نہ ہو۔	
اور مجرمین کی کبھی مدد نہ کرو۔	۱۸
دشمن سے بھی عدل کرو۔	//
خونِ ناحق جرمِ عظیم ہے۔	۱۹
قتل کے جرم میں قصاص کا حیات پرور اصول	//
رہزنی و قزاقی کے خلاف۔	//
اسلام کے خلاف سب سے بڑا الزام —	۲۰
اشاعت بزورِ شمشیر	
ایمان سے مفہوم قلب کی تبدیلی ہے اور یہ	۲۲
تبدیلی جبر و اکراہ سے نہیں ہو سکتی۔	
اگر جبر و اکراہ مقصود ہوتا تو خدا تمام انسانوں	//

مضمون	صفحہ
کو پیدائشی طور پر ایک ہی مسلک کا پیرو کر دیتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔	
اس نے حق و صداقت کو واضح کر دیا' اب انسان کو اختیار ہے کہ وہ جونسی راہ چاہے اختیار کر لے۔	
جَور و اکراہ اس کے نزدیک تغلّب و استبداد ہے۔	۲۴
ایمان' قلب کی گہرائیوں میں اُترے ہوئے اقرار کا نام ہے۔ اسی لئے قرآن کی رُو سے مرتد کی کوئی سزا نہیں۔	۲۵
اس لئے کہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ	//
لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام اس قدر صلح و آشتی کا مذہب ہے تو پھر نبیؐ اکرمؐ نے اس قدر جنگ کیوں کئے۔	۲۶
یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم مذہب اور دین میں فرق نہیں کرتے۔	//
مذہب کیا ہے؟	//
اسلام' مذہب نہیں' دین ہے۔	//
دین کے معنی	//
دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں نظامِ مملکت' یا آئینِ حکومت۔	//
اسلام کا نظامِ مملکت۔	//

مضمون	صفحہ
اس کی اساس و بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ	
(۱) تمام انسان برابر کے حقوق رکھتے ہیں اور	
(۲) قانون سازی کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں	
اس نظام کی بنیاد عدل پر ہوتی ہے۔	
عدل کا مفہوم دورِ حاضرہ میں	۲۸
زیادہ سے زیادہ یہ کہ مروّجہ قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔	//
لیکن قرآن کی رُو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔	//
دین کے اجزائے ترکیبی۔	۲۹
اسی کا نام اسلام ہے۔	۳۰
اسی اجمال کی تفصیل قرآن کے مختلف گوشوں سے۔	//
حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک۔ دین کا قیام۔	۳۱
دین کی اساس و بنیاد۔ صرف اللہ کی محکومیت	//
اور اس کی عملی شکل۔	
اطاعتِ قرآنِ کریم۔	//
اسی کو عبادت کہتے ہیں۔	//
عبادت کے صحیح معنی۔ اطاعت و محکومیت' نہ کہ بندگی اور پرستش۔	//
لہٰذا' اگر سیاست سے خدا الگ ہو جائے تو	۳۲

مضمون	صفحہ
وہ چنگیزیت ہے۔ اور اگر سیاست دین سے الگ ہو جائے تو رہبانیت۔	
مذہب و سیاست کی یہی تفریق تھی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔	۳۲
بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت یہی تفریق ساری دنیا پر چھا رہی تھی۔	//
یہ ہے دین کا صحیح مفہوم۔	//
لیکن کوئی دین (نظامِ مملکت) بغیر قوتِ نافذہ دین نہیں رہ سکتا۔	//
دین کے ساتھ جب قوت شامل ہو تو اسے استخلاف فی الارض کہا جاتا ہے۔	۳۴
قوتِ تنفیذ دین کے لئے لاینفک ہے۔	//
باب دوم	۳۶
نظامِ مملکت کا نام دین ہے۔	۳۷
جہاد کے معنی	//
جہاد اور قتال (جنگ) میں فرق۔	//
جنگ کی اجازت کن کن مواقع پر دی گئی۔	۳۹
اس وقت تک لڑتے رہو جب تک نظامِ مملکت خالص اللہ کے لئے نہ ہو جائے۔	۴۰
جنگ کی تیسری شکل ۔ مسلمانوں کو حقِ تبلیغ دیا جائے گا جو اس سے مانع آئے گا اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔	۴۲
یہ جنگ معاہدات شکنی کی جنگ ہوگی۔	۴۳
قرآن اور معاہدات کا احترام۔	۴۴
عہدِ حاضر کی سیاست اور معاہدات کا احترام۔	۴۵
میکیاؤلی کا فلسفۂ روباہی۔	//
ہندو سیاست کے امام "کاٹلیا" کا فلسفۂ فریب کاری۔	۴۶
کفارِ عرب بھی مسلمانوں کے خلاف عہد شکنی کرتے تھے۔	۴۷
مظلومین کی حمایت میں جنگ۔	۴۸
جنگ کی داخلی شکلیں ۔ (i) نظامِ مملکت (دین) سے بغاوت، یعنی مسلمان رہتے ہوئے قوانینِ اسلامی کی مخالفت۔	۵۱
(ii) بظاہر جماعت کے ساتھ لیکن درپردہ اس کی مخالفت۔ اسے منافقت کہتے ہیں۔	//
اسلام نے جنگ کی اجازت اس لئے دی ہے تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔	۵۲
باب سوم	۵۳
ایک جماعت جو اصولاً جنگ کو خلافِ انسانیت قرار دیتی ہے۔	//
لیکن خود عیسائی مؤرخین اور فلاسفروں نے اس طرزِ زندگی اور تعلیم کو غیر فطری اور ناممکن العمل قرار دے دیا ہے۔	۵۴

مضمون	صفحہ
نیٹشے. بیکی. ڈارسے. لوئی. فرائڈ. برفو وغیرہ کی تصریحات۔	۵۴
اب عیسائیت خود اس فلسفۂ زندگی کو چھوڑ رہی ہے۔	۵۷
ہندو مذہب اور جنگ۔	۵۹
ویدوں میں جنگ کے احکام۔	//
مہابھارت اور رامائن کے قواعدِ جنگ و قتال	//
دورِ حاضرہ میں اہمسا کی تعلیم۔ مہاتما گاندھی کا فلسفہ۔ لیکن خود گاندھی جی کا اعتراف کہ بدلہ لینا ضروری ہے۔	۶۰
عدمِ تشدد کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے اور کسے دی جاتی ہے۔ یورپ کے مسیحی مناد، درحقیقت وہاں کی استعماریت کے ہراول دستہ ہوتے ہیں۔	۶۱
مسیح کے مناد۔ اور "قادیان کا نبی" ایک ہی مقصد کے حصول کے ذرائع۔	۶۲
اس کا دفعیہ ـــــ پیامِ اقبالؒ	۷۰
بدھ مت اور جین مت کی تعلیم اور اس کا نتیجہ	//
حکومت کا قیام ہی قوت پر ہوتا ہے۔	۷۱
حکومت کو ہر روز "جنگ" کرنی پڑتی ہے۔	//
شر کی مدافعت، دین کی اصل ہے۔	۷۲
قرآن کی تعلیم	۷۳
برائی کی مدافعت بطریقِ احسن کرو۔	//
اس کا مفہوم	
بابِ چہارم	۷۵
یونان کا غلط نظریۂ کائنات	//
قرآن کا صحیح نظریہ۔ کائنات حرکیاتی ہے	//
ہر شے آگے بڑھنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے۔	//
جہاد، عملِ پیہم کا دوسرا نام ہے۔	۷۶
اس کا نقطۂ آخریں تسلیمِ جاں ہے، اسی کا نام قتال ہے۔	//
جہاد ہی خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔	۷۷
اسی سے مدارج و جنت ملتی ہے۔	//
مومن کی زندگی ـ تنفیذِ احکامِ الٰہیہ کے لئے ہوتی ہے اس مقصد کے حصول میں ہر حرکت جہاد ہے۔	۷۸
زندگی، نفس شماری کا نام نہیں۔	//
اس لئے حیاتِ ابدی ان ہی کا حصہ ہے جو جہاد میں شہید ہوتے۔	۸۱
زوال و عروجِ امم کا محکم اصول۔	۸۲
مسلمانوں نے عجمی اثرات کے ماتحت اس جذبۂ جہاد کو بھلا کر بہانہ سازیوں کو مسلکِ حیات قرار دے لیا۔	۸۴
عجمی تصوف اور اس کی عزلت گزینیاں	//

مضمون	صفحہ
اسی بہانہ سازی کا کرشمہ ہیں۔	
اور اربابِ شریعت کی برہمنیت بھی۔	۸۵
ایک اہم ضمنی گوشہ — غلامی	۸۶
غلامی۔ انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ	//
جنگ کے قیدی غلام بنائے جاتے تھے۔	۸۷
قرآن نے اسے یکسر روک دیا۔ لیکن جو غلام پہلے سے موجود تھے ان کے متعلق احکام ضروری تھے۔	//
جب تک گھروں میں رہیں اُن سے حُسنِ سلوک کیا جائے۔	۸۸
لونڈیوں سے تمتع کو ناجائز قرار دیا اور انہیں	۹۰
بیوی کا متعارف درجہ عطا کر دیا۔	
اس طرح غلامی کا خاتمہ ہوگیا۔	۹۱
لیکن مسلمانوں نے اپنے اس دورِ ملوکیت میں اس لعنت کو پھر سے اختیار کر لیا۔	۹۲
اور اس کے جواز میں روایات وضع کر لیں۔	//
یہی روایات آج غلامی کے جواز کی دلیل بیان کی جاتی ہیں اور مسلمانوں میں اس لعنت کی موجودگی کا موجب ہیں۔	

○

باب اوّل

جہاد

وَجَاهِدُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

زندگی جُہد است و استحقاق نیست!

پروپیگنڈہ ـــــ یعنی وہ فن جس کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ جھوٹ کو سو مرتبہ دُہرایئے سچ بن کر دکھائی دینے لگ جائے گا۔ اس کا یہ دعویٰ کسی اور شعبے میں کامیاب ہوا یا نہ، لیکن اسلام کے متعلق غلط فہمی پیدا کرنے میں جس حد تک یہ کامیاب ہوا ہے تاریخ کے صفحات پر اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ اپنی تمام تاریخ میں ایک مرتبہ ایک مرکز پر جمع ہوا ـــــ اور دنیائے انسانیت کی بدبختی کہ اس کا یہ اتحاد صلیبی جنگوں کی صورت میں اسلام کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے ہوا۔ ان جنگوں میں یورپ کی شکست اس کے لئے ایک بہت بڑے جاں گداز اور دل سوز صدمے کا موجب تھی۔ مرورِ زمانہ نے اس زخم کو یورپ کے دماغ سے شاید مندمل کر دیا ہو لیکن اس کے تحت الشعور میں اس کا گہرا اثر ابھی تک

یورپ کا جذبۂ انتقام

باقی ہے۔ یہ وہ پھانس ہے جس نے اسے کبھی چین کی نیند نہیں سونے دیا۔ اور وہ اس شکست کے انتقام کی فکر میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتا رہا ہے۔ کسی قوم سے انتقام لینے کی ایک صورت تو وہ ہے جو چنگیز و ہلاکو کی داستانوں کی صورت میں تاریخ کے صفحات پر خون کے حروف سے لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دورِ جہالت کی باتیں سمجھی جاتی ہیں جس میں انسان نے ابھی تک یہ نہیں سیکھا تھا کہ اپنی سبعیت و بربری کے تیز ناخنوں کو کس طرح جھوٹی ہمدردی کے نرم و نازک پنجوں میں چھپائے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئندہ حریری نقاب اوڑھائے وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بتا کر، جتا کر کرتا تھا۔ لیکن جب

انسان نے عقل وحکمت اور دانش وبینش" میں ترقی کی تو اس نے اس طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کو حماقت سمجھا. اب سب سے زیادہ کامیاب وہ قرار پایا جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ کہیں نظر نہ آئے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شُبہ تک نہ ہو — وہ ناصح و مصلح کے لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے، دریں حالیکہ مٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جہالت کے انسان کی جور وستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفانِ بلاخیز تھا. جو کف بر دہاں، بڑھتا، اُمنڈتا، بپھرتا چلا آئے کہ جس کی شورشوں کو اندھے بھی دیکھیں اور بہرے بھی سُنیں، لیکن دورِ عقل وتدبّر کے فسوں ساز انسان کے انتقام وتخریب کی چالیں ایک پرسکوت دریا کی طرح ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموّج، نہ حرکت ہے نہ تلاطم لیکن سطحِ آب کے نیچے ایسے اژدر ونہنگ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو نگل جائیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سُننے والے کان سُن سکیں. اس پرسکوت طریقِ تخریب واستہلاک کا نام ہے پروپیگنڈا! یہ وہ آتشِ خاموش ہے کہ اندر ہی اندر تمام متاعِ دین ودانش کو راکھ کا ڈھیر بنا دے اور سطح سے اوپر دھوآں تک نہ ہو. یہ وہ خاموش ومنظم سازش ہے جس سے آہستہ آہستہ، بتدریج، بلاشور وشغب، غیر محسوس طور پر اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویئے بدل جاتے ہیں اور اس کے بعد فریقِ مخالف جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے. یہی وہ سحرِ سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں، کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۷/۱۷۹) وہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

دولِ یورپ نے اسلام سے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے اسی سحرِ سامری سے کام لیا اور اس منظم لیکن خاموش طریق سے پروپیگنڈا کیا کہ اسے دنیا کی نگاہوں میں کچھ سے کچھ بنا کر رکھ دیا اور زبان و

اسلام کی تصویر

قلم کے زور سے اس کی ایسی بھیانک اور خوفناک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر، خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں. اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب وتمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے قتل وغارت گری،

بربادی و تباہی، ہلاکت و خونریزی، جور و ظلم، ستم و استبداد کے خونین مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ حوادث کی طرح بڑھتے چلے آرہے ہیں، جن کے جلوس میں سبعیت و بربریت کے مجسّمے، ہولناک جنات و عفاریت کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے، اللہ اکبر کے نعروں میں اُمنڈے آرہے ہیں۔ اور اس قہرِ خداوندی، اس سیلابِ بلا کے سامنے، تہذیب و تمدّن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف عفت و عصمت، مذاہب و مسالک کے پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے سایہ دار درخت ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کی ہزارہا سال کی محنت و کاوش نے جو کچھ متاعِ علم و ہنر اکٹھی کی تھی وہ سب خس و خاشاک کی طرح بہے چلی جاتی ہے۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا آہ و فغاں، آسمان تک جاتا اور واپس آجاتا ہے، گویا (معاذ اللہ) اس خونخوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے، آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں، تہذیب و تمدّن کے آئینہ دار ایوانات و قصور کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں، کسی جگہ زنار کا ڈھیر نظر آتا ہے، منادر ویران ہیں، گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امان ہے، نہ کلیسا کے راہب کے لئے عافیت، نہ عورتیں محفوظ ہیں، نہ بچّے مصئون، کچھ قتل کر دیئے گئے، جو باقی بچے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے وحشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جارہے ہیں کہ وہاں احترامِ انسانیّت کو دو دو ٹکوں میں فروخت کر دیا جائے۔

یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے آکر پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے، حقارت و نفرت، انتقام و تعاقب کے بخارات قلب سے اُٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اسے اِس عالم سوز تہذیب اور ننگِ انسانیّت تمدّن، اس وحشیانہ تعلیم اور اس بہیمانہ مذہب کو دنیا سے مٹانے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔

امن و سلامتی کا دین

یہ تصویر اس اسلام کی بتائی جاتی ہے جس کی تعلیم کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ وہ انسان کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ

اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (۵/۱۵-۱۶)

اے اہلِ کتاب! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی اور ایسی کتاب آچکی ہے جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن ہے، خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو اس کے قوانین سے ہم آہنگ زندگی بسر کریں، سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے۔

جس کا بنایا ہوا راستہ نوعِ انسانی کو اس منزل تک لے جاتا ہے، جسے دار السلام یعنی امن و سلامتی کا گھر کہا جاتا ہے۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۲۸)

ان لوگوں کے لئے (جو خدا کی سیدھی راہ پر گامزن ہوئے) ان کے پروردگار کے نزدیک سلامتی اور عافیت کا گھر ہے اور وہ ان کے اعمالِ حسنہ کی وجہ سے ان کا مددگار و رفیق ہے۔

یہی وہ امن و سلامتی کا گوشہ ہے جس کی طرف اس کا خدا دعوت دیتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۱۰/۲۵)

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جو چاہتا ہے، اسے (کامیابی و نجات کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

اور جس میں تمام افکار و اعمال کا منتہیٰ اور سعی و کاوش کا مقصود سلامتی کی جنّت ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ؕ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ (۱۵/۴۵ - ۴۶)

بلاشبہ متقی انسان باغوں اور چشموں (کے عیش و راحت) میں ہوں گے (انہیں کہا جائے گا) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

فساد کے خلاف

اس اسلام کے بھیجنے والے خدا کی ایک صفت المؤمن ہے جس کے معنی ہیں امنِ عالم کی ضمانت دینے والا، ایک صفت السّلام ہے۔ خود اس دین (اسلام) کے معنی امن و سلامتی کے ہیں اور اس کے ماننے والے مؤمن (امن کے ذمّہ دار) اور مسلم

کہلاتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیم امن وسلامتی کا پیام ہے۔ وہ فساد برپا کرنے والوں کو خدا کے عذاب کا مستحق قرار دیتا ہے۔ سورۂ رعد میں دیکھئے۔ اہلِ جنّت کو کس طرح امن وسلامتی کی تبریک وتہنیت کی صداؤں سے نوازا گیا ہے اور ان کے برعکس فساد برپا کرنے والوں کو خدا کی عنایات سے محروم بتایا گیا ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا .... اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ٥ (۱۳/۲۳-۲۵)

(بلاشبہ یہی لوگ ہیں (جن کے لئے ہمیشگی کے) باغ ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد، بیویوں اور اولاد میں سے، جو نیک کردار ہوں گے وہ بھی جگہ پائیں گے اور (وہاں کی زندگی ایسی ہوگی) کہ ہر دروازے سے فرشتے ان پر آئیں گے اور (کہیں گے کہ) تم پر سلامتی ہو کہ تم نے استقامت کا ثبوت دیا۔ سو کیا ہی اچھا اس گھر کا انجام ہوا اور جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کا عہد مضبوط کرنے کے بعد پھر اسے توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کر ڈالتے ہیں اور ملک میں شر و فساد برپا کرتے ہیں ان کے لئے سعادتوں سے محرومی ہے اور بُرا ٹھکانا۔

وہ صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ دنیا میں تباہی اور خرابی پیدا کرنے والا مسلک کبھی خدا کو پسند نہیں ہو سکتا۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ٥ (۲/۲۰۵)

اور جب انہیں حکومت مل جاتی ہے تو ان کی تمام سرگرمیاں ملک میں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ خرابی پھیلائیں اور انسان کی زراعت ومحنت کے نتائج اور اس کی نسل ہلاک کر دیں حالانکہ اللہ کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ (زندگی وآبادی کی جگہ) ویرانی اور خرابی پھیلائی جائے۔

وہ اسے فاسقین کا مسلک بتاتا ہے جو یکسر مومنین کی ضد ہیں۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ .... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥

(۲/۲۶ - ۲۷)

قانونِ خداوندی کی رُو سے وہ لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں جو فاسق ہیں (فاسق کون ہیں،

جو احکامِ الٰہی کی اطاعت کا عہد و میثاق کر کے پھر اسے توڑ ڈالتے ہیں اور جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے ان کے قطع کرنے میں بیباک ہیں اور (اپنی بدعملیوں اور سرکشیوں سے ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔ سو (جن لوگوں کی شقاوتوں کا یہ حال ہے وہ ہمیشہ گمراہی کی چال ہی چلیں گے اور فی الحقیقت) یہی لوگ ہیں جن کے لئے سرتاسر نامرادی اور نقصان ہے۔

وہ کھلے ہوئے الفاظ میں انسان کو اس ہلاکت انگیز روش سے روکتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (۷/۵۶)

اور (دیکھو!) ملک کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی نہ پھیلاؤ۔ دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت دونوں صورتوں میں اس کے قانون کے مطابق چلو۔ یقیناً اللہ کی رحمت ان سے قریب ہے جو توازن بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔

چونکہ جنت امن و سلامتی کا گھر ہے اس لئے وہ غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا گزر نہیں ہو سکتا جو دنیا میں سرکشی اور طغیان کی روش اختیار کر کے فساد برپا کرتے رہے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ط وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ (۲۸/۸۳)

اس آخرت کے (امن و سلامتی کے) گھر کو (فی الحقیقت) ہم نے انہی لوگوں کے لئے بنایا ہے جنہوں نے دنیا میں سرکشی اور فساد برپا نہیں کیا اور دراصل آخرت (کی بھلائیاں) انہی لوگوں کے لئے ہیں جو اختیار کرتے ہیں۔

وہ امم سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کی تباہیوں اور بربادیوں کی عبرت انگیز داستانیں بیان کرتا ہے تو اس لئے کہ اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ فتنہ و فساد شرفِ انسانیت کے کس قدر خلاف ہے اور اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں وہ فرعون اور اس کی قوم کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کرتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ مفسدین تھے۔ (۲۷/۱۴ ؛ ۲۸/۴)

فرعون، جور و استبداد اور تکبّر و رعونت کا مجسمہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی قارون، سرمایہ داری کا پیکر تھا اور چونکہ طاغوتی سیاست کے ساتھ ساتھ، سرمایہ داری بھی دنیا میں کچھ کم فساد برپا نہیں کرتی، اس لئے

قارون کے متعلق بھی بتا دیا گیا کہ وہ بھی مفسدین میں سے تھا۔ (۲۸/۷۶-۷۷)

وہ اُمم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد بصد تأسف کہتا ہے کہ ان میں سے ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جو انہیں فساد انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں سے روکتے! (۱۱/۱۱۶)

وہ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان بار بار دہراتا ہے اور دیدۂ اعتبار کی توجہ ان کے اس جرم کبیر کی طرف منعطف کراتا ہے کہ

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۵/۶۴)

یہ لوگ جب بھی کبھی لڑائی کی آگ سلگاتے ہیں، اللہ اسے بجھا دیتا ہے (یعنی اس کا فتنہ تمام ملک میں نہیں پھیلنے پاتا) یہ لوگ ملک میں خرابی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ خرابی پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بعثتِ نبیٔ اکرمؐ کا مقصد

حتیٰ کہ وہ اسلام کے ظہور کا مقصد اور نبیٔ کریمؐ کی بعثت کی غایت یہی قرار دیتا ہے کہ اُس زمانہ میں دنیائے فکر و عمل کے ہر گوشے میں فساد رونما ہو چکا تھا۔ اور اس فساد کو مٹانے کے لئے نظامِ خداوندی کی ضرورت تھی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۳۰/۴۱)

(ہم نے پیغمبرِ اسلام کو اس لئے مبعوث کیا ہے کہ چونکہ لوگوں کے خود کردہ اعمال کی بدولت، فساد نے خشکی و تری (دونوں کو) گھیر لیا ہے (یعنی تمام عالم میں فتنہ و فساد پھیل گیا ہے) اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا (قانونِ مکافات) لوگوں کو ان کے خود کردہ اعمال کا مزہ چکھائے۔ ممکن ہے کہ لوگ (اپنے انکار و سرکشی کے تباہ کن نتائج کو دیکھ کر باز آ جائیں اور نظامِ خداوندی کی طرف) لوٹ آئیں۔

چنانچہ اس کی دعوت کی پہلی آواز یہی تھی کہ اللہ کی زمین میں فساد مت برپا کرو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۲/۱۱-۱۲)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں خرابی نہ پھیلاؤ تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے کام خرابی کا

(باعث کیسے ہو سکتے ہیں) ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں۔ یاد رکھو! یہی لوگ ہیں جو خرابی پھیلانے والے ہیں اگرچہ (جہل و سرکشی سے اپنی حالت کا) شعور نہیں رکھتے۔

اسی لئے وہ فساد کو ایمان و عملِ صالح کی ضد قرار دیتا ہے کہ یہ دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ﴿۳۸/۲۸﴾

(کیا تم یہ سمجھتے ہو؟) کہ ہم ان لوگوں کو بھی جو ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کی راہ اختیار کی باعتبارِ نتائج، ملک میں فساد پھیلانے والوں کی طرح بنا دیں گے۔ یا ہم تقویٰ اختیار کرنے والوں کو (باعتبارِ اجرِ عمل) فُسّاق و فجّار کی طرح کر دیں گے۔ (یاد رکھو یہ ہمارے قانونِ مجازات کے خلاف ہے)۔

کہئے! جس نظامِ زندگی کے بنیادی عناصر یہ ہوں اس کی تصویر وہ ہو سکتی ہے جس کا خاکہ گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکا ہے؟ کیا یہ دین، دنیا میں امن و سلامتی کا کفیل ہوگا یا فتنہ و فساد کا مظہر؟ تو کیا یہ نوعِ انسانی کی بدبختی نہیں کہ اس نے صلح و آشتی کے اس پیامبر کو، جور و استبداد کا داعی سمجھ لیا اور اس طرح تریاق کو زہرِ ہلاہل سمجھ کر اس کے استعمال سے اجتناب کیا اور مرض کو لاعلاج قرار دے کر سسک سسک کر جان دے دی؟

مُسلمان کی رَوش صُلح و آشتی

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رُو سے مسلمان کی تو یہ کیفیت ہے کہ کسی کے خلاف ناحق ہاتھ اٹھانا تو ایک طرف، وہ غیر مذہب والوں کی گالی کا جواب بھی گالی سے نہیں دے سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص نبیٔ اکرمؐ کی شانِ اقدس و اطہر میں (پناہ بخدا) گستاخی کے کلمات زبان پر لائے، تو مسلمان اس کے جواب میں اس کے بانیٔ مذہب کی شان میں سوءِ ادبی نہیں کر سکتا اس لئے کہ اگر وہ بانیٔ مذہب ان انبیاء کرامؑ میں سے ہے جن کا ذکر قرآنِ کریم میں بصراحت موجود ہے تو ایک مسلمان کے لئے ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور اگر اس کا ذکر قرآن میں صراحتاً نہیں آیا، تو چونکہ قرآنِ کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ملک میں انبیاء کرامؑ بھیجے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کا ذکر قرآن میں صراحتاً نہیں آیا، اس لئے ہو سکتا ہے وہ بانیٔ مذہب ان حضرات انبیاء کرامؑ میں سے ہو جن کا ذکر قرآن میں اس طرح اجمالاً آیا ہے اس لئے وہ ان کے خلاف بھی گستاخی کا کلمہ زبان پر نہیں لا سکتا۔ غیر مسلموں کے مذہبی بزرگ تو ایک طرف رہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ:۔

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ...... یَعْمَلُوْنَ ۝
(۶/۱۰۸)

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو بھی دشنام نہ دو کہ پھر وہ حد سے متجاوز ہو کر بے سمجھے بوجھے خدا کو برا کہنے لگیں۔

عدل وانصاف

یہ تو تھا دوسروں کے جذبات کا احترام، معاملات میں جس شدت و تکرار سے عدل و انصاف کی تعلیم قرآنِ کریم میں آئی ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ بار بار کہا گیا ہے کہ فیصلے ہمیشہ عدل کے مطابق کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (۴/۵۸)

(مسلمانو!) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو چاہیئے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

دوسرے مقام پر ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰)

(مسلمانو!) اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملہ میں) انصاف کرو! (اور مزید برآں) احسان بھی کرو۔

سچّی گواہی

عدل کا مدار شہادت پر ہے۔ اس باب میں دیکھئے قرآنِ کریم کی تعلیم کیا ہے؟ فرمایا۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ....
فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝ (۴/۱۳۵)

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے سچّی گواہی دینے والے ہو۔ اگرچہ تمہیں خود اپنے خلاف یا اپنے ماں باپ کے خلاف۔ یا اپنے قرابت داروں کے خلاف ہی گواہی دینی پڑے۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے بڑھ کر ان کا خیال رکھنے والا ہے (تمہیں ایسا نہیں چاہیئے کہ کسی مالدار کی دولت کی طمع میں، یا کسی محتاج کی محتاجی سے بے اعتنائی برت کر سچّی بات کہنے سے جھجکو۔ پس دیکھو ایسا

نہ ہو کہ تمہارا ذاتی رجحان تمہیں انصاف سے باز رکھے. اور اگر تم (گواہی دیتے ہوئے) بات کو گھما پھرا کر کرو گے (یعنی صاف نہ کہنا چاہو گے) یا گواہی دینے سے پہلوتہی کرو گے تو (یاد رکھو) تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

مجرم کی مدد جرمِ عظیم ہے

اور مجرم کی مدد کرنا تو اس کے نزدیک جرمِ عظیم ہے. قصہ حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں ارشاد ہے.

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ه

(۲۸/۱۷)

(موسیٰؑ نے) کہا کہ اے میرے پروردگار جس طرح تو نے (اب تک) مجھ پر انعام و مہربانی ہے (اسی طرح میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ) میں کبھی بھی مجرمین کا رفیق و مددگار نہ بنوں گا.

اس سے بھی آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ عدل کے معاملہ میں قرآن کس قدر بلند معیار قائم کرتا ہے ۔ دوستوں سے عدل و انصاف عام انسانی روش ہے. اجنبی سے عدل بھی قرینِ قیاس ہے. لیکن ایک

دشمن سے عدل

قوم سے آپ کی کھلی ہوئی دشمنی ہے. وہ آپ کی تخریب کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے. وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے. وہ آپ کی ضرر رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی. اس قوم یا اس قوم کے کسی فرد کا کوئی معاملہ آپ کے سامنے آتا ہے. اس وقت عدل کے تقاضے سے اپنی قوم (یا اپنی قوم کے کسی فرد) کے خلاف اور دشمن کے حق میں فیصلہ دینا، یہ ہے مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. قرآن اسی عدل کا حکم دیتا ہے. فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ .... اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ه (۵/۸ نیز ۵/۲)

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ خدا (کی سچائی) کے لئے مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف کے لئے گواہی دینے والے ہو. اور (دیکھو!) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لئے اُبھار دے کہ (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو! (ہر حال میں) انصاف کرو کہ یہی تقوے سے لگتی ہوئی بات ہے. اور قوانینِ خداوندی (کی خلاف ورزی کے نتائج) سے ڈرو! تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے.

"دشمن سے پیار کرو" جذباتی شاعری سے زیادہ کچھ نہیں. جب تک انسان کے سینہ میں دھڑکنے والا دل موجود ہے. اس کے لئے دشمن سے پیار کرنا ناممکن ہے. یہ تعلیم نفسیاتی تضاد ہے. البتہ دشمن سے عدل، یہ ممکن ہے. لیکن اس امکان کو عمل میں لانے کے لئے جس کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف، جس ہمت اور حوصلہ، بالفاظِ دیگر جس پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کیرکٹر کی ضرورت ہے وہ کسی نگہ حق شناس کے لئے محتاجِ تشریح نہیں "دشمن سے بھی انصاف کرو" اس تعلیم کی نظیر آپ کو دنیا کے کسی اور ضابطۂ اخلاق و قوانین میں بمشکل مل سکے گی. کہیئے کہ جس دین کی یہ تعلیم ہو، اسے جور و استبداد کا مذہب قرار دینا کس قدر حق اور انصاف سے چشم پوشی، اور عدل و صداقت سے پہلو تہی ہے.

خونِ ناحق قرآن نے دنیا کو وحدتِ خلق کی بلند ترین حقیقت اور احترامِ انسانیت کے اشرف ترین اصول سے روشناس کرایا. اس سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی کتنی بڑی قیمت ہوسکتی ہے. اور کسی کی جان لینا اس کے ضابطۂ آئین و دستورِ حیات میں کیسا جرمِ عظیم ہے؟ انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو واضح کرنے کے لئے اس نے ایسا جامع اور بلیغ بیان اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف وحدتِ خلق کا عالمگیر اصول نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور دوسری طرف قتلِ ناحق کے خلاف شدید ترین سرزنش و عتاب کا پہلو بے نقاب ہوجاتا ہے. سورۂ مائدہ میں ہے.

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ .... اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ۭ (۵/۳۲)

اسی بناء پر ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جس کسی نے سوا اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں لوٹ مار مچانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی جان کو قتل کر ڈالا. تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا. اور جس کسی نے کسی کی زندگی بچالی، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی.

خون بہا اور اس تنبیہہ و سرزنش کے باوجود اگر کوئی خلاف ورزیٔ قانون کرے تو اس کے لئے قصاص کا حیات بخش اور عدل پرور آئین موجود ہے. (۲/۱۷۸)

رہزنی و قزاقی باقی رہی لوٹ مار، رہزنی، قزاقی، غارت گری تو قرآنِ کریم نے انہیں جرم قرار دیا ہے اور ان کی سزا مقرر کی ہے. خواہ مجرم مسلم ہو یا غیر مسلم اور لٹنے والا مومن ہو

یا کافر!

○

زمانہ کی جہالت اور تعصب نے اسلام کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی ہے اس میں سرفہرست یہ لکھا ملتا ہے کہ اس میں دوسروں کو بہ جبر مسلمان کیا جاتا ہے اور اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا جاتا ہے۔

اسلام اور شمشیر

یہ الزام زندہ شہادت ہے اس حقیقت کی کہ انسان جب جوشِ انتقام اور جذبۂ مخالفت سے اندھا ہو جاتا ہے تو کس طرح ان حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ جو دنیا کے کسی پردہ سے بھی چھپ نہیں سکتے۔ اور کس طرح اس واضح تعلیم سے چشم پوشی کرتا ہے۔ جو بلا تاویل و تفسیر اپنے آپ کو ہر دیدۂ بینا کے سامنے بے نقاب پیش کر رہی ہے۔ قرآن کوئی کتابِ مستور نہیں جس کی رسائی صرف خواص تک ہو۔ کوئی باطنی تعلیم نہیں ـــ جو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھی جائے۔ کسی مردہ زبان میں نہیں کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہ آسکے۔ سیدھی سادی عربی زبان کی ایک کتاب ہے جو ہر کتب فروش کی دکان سے مل سکتی ہے۔ اس کے تراجم قریب قریب دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ جس کا جی چاہے اسے لے کر پڑھے اور خود معلوم کر لے کہ اس کی تعلیم کیا ہے۔ لیکن اتنی تو وہ تکلیف گوارا کرے جسے حقیقت کی تلاش اور صداقت کی آرزو ہو۔ جن کا مقصد دوسروں کو بدنام کرنے کے لئے غلط پروپیگنڈا کرنا ہو۔ وہ ایسا کیوں کریں۔ وہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹا کر (جو اسلامی تعلیم کی اساس اور یقینی سند ہے) انہیں غلط تاریخ و روایات کے خرافات میں الجھا دیں گے۔ اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیں گے۔ قرآن کے نزدیک ایمان کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ جو بات دل و دماغ کی پوری رضامندی سے نہ مانی جائے اسے ایمان کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے ایمان اور جبر و اکراہ ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ وہ اس حقیقت کا واضح طور پر اعلان کرتا ہے۔ کہ اگر مقصود یہ ہوتا کہ تمام انسان، اپنے اختیار و ارادہ کو عمل میں لائے بغیر، ایک نہج پر چلنے کے لئے مجبور ہوں، تو خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ دیگر اشیائے کائنات کی طرح انسان کو بھی پیدائشی طور پر ایک مسلک پر چلنے کا پابند کر دیتا۔ لیکن یہ مقصودِ مشیت نہیں تھا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنْ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا

نَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (۵/۴۸)

اور خدا چاہتا، تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا (یعنی ایک راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کرتا) لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس لئے نہیں کیا تا کہ جو کچھ ارادے اور اختیار کی صلاحیتیں تمہیں دی گئی ہیں، انہیں بروئے کار لانے کے مواقع بہم پہنچائے۔ پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو! بالآخر تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ جن باتوں میں تم باہمد گر اختلاف کرتے تھے، ان کی اصل و حقیقت کیا ہے...... ؟

اس سے بھی واضح الفاظ میں ہے:۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (۱۰/۹۹)

اور اے پیغمبر! اگر تیرا پروردگار چاہتا، تو جتنے آدمی رُوئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ لیکن تُو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی مشیّت یہی ہوئی کہ انسان کو اختیار و ارادہ کے ظہور کے مواقع دیئے جائیں۔ پھر اگر لوگ نہیں مانتے تو کیا ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں ؟

سورۃ انعام میں ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۗ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۝ (۶/۱۰۸)

اور اگر اللہ چاہتا تو (اس کی قدرت رکھتا تھا کہ انسان کو اس طرح پیدا کر دیتا کہ سب ایک راہ چلنے والے ہوتے۔ اور یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی مشیّت کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان اپنے فیصلے کے مطابق جو راہ چاہے اختیار کرے۔ پس تم جو کچھ کر سکتے ہو یہی ہے کہ سچائی کی راہ انہیں دکھا دو! انہیں جبراً اپنی راہ پر نہیں چلا سکتے)۔ ہم نے تمہیں ان پر پاسبان نہیں بنایا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ خدا نے حق و صداقت کو واضح طور پر آشکارا کر دیا۔ اب اس کے بعد جس کا جی چاہے

انسانی اختیار و ارادہ

اسے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ..... (۱۸/۲۹)

اور کہہ دو کہ یہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جو چاہے اسے مانے اور جو نہ چاہے نہ مانے۔

جو اس پیغامِ حق و صداقت کو قبول کرلے گا اس کی ذات ارتقائی منازل طے کرکے اسے سفرِ حیات کی منزلِ مقصود تک پہنچادے گی۔ جو ایسا نہ کرے گا وہ اس شرف و سعادت سے محروم رہ جائے گا۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (۶/۱۰۴-۱۰۵)

تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس علم و دلیل کی روشنیاں آچکی ہیں (اور جہل و گمراہی کا اب کوئی عذر باقی نہیں رہا) پس اب جو کوئی دیکھے اور سمجھے تو (اس کا فائدہ) خود اسی کے لئے ہے اور جو کوئی (اپنی آنکھ سے کام نہ لے اور) اندھا ہو جائے تو اس کا وبال اسی کے سر آئے گا۔ اور (اے پیغمبر تم کہہ دو) میں تم پر کچھ پاسبان نہیں ہوں کہ (جبراً تمہاری آنکھیں کھولوں) اور (دیکھو) اسی طرح گوناگوں طریقوں سے ہم اپنے قوانین کی وضاحت کرتے ہیں (تاکہ حجت تمام ہو جائے) اور لوگ خود پکار اٹھیں کہ تم نے (بیانِ حق میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ سب کچھ) پڑھ سنایا۔ نیز اس لئے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں ان کے لئے (دلائلِ حق) واضح کردیں!

اسی حقیقت کو سورۃ یونس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ○ (۱۰/۱۰۸ نیز ۳۹/۴۱)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس

آگئی ہے. پس جو کوئی ہدایت کی راہ اختیار کرے گا، تو اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا. اور جو بھٹکے گا، تو اس کی گمراہی اسی کے آگے آئے گی. میں تم پر نگہبان نہیں ہوں (کہ تمہیں زبردستی صحیح راہ پر چلاؤں)۔

وہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو دیکھنے کے لئے دو آنکھیں عطا کر دیں! اور فضا میں روشنی پھیلا دی. اب جس کا جی چاہے سیدھی راہ پر چلے. اور جو اپنی ہلاکت چاہتا ہے وہ غلط روش اختیار کر لے.

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝ (۷۶/۳ نیز ۳۹/۱۰)

ہم نے بلاشبہ انسان کی راہ نمائی راہ (حق و صداقت) کی طرف کر دی. اب وہ چاہے تو اسے اختیار کرے یا اس سے انکار کر دے.

قرآن، خدا کی طرف سے دی ہوئی مستقل اقدار کی یاد دہانی ہے جو چاہے اس سے فائدہ اٹھالے.

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۷۴/۵۵ نیز ۸۰/۱۱-۱۲؛ ۸۱/۲۸؛ ۷۳/۱۹؛ ۷۶/۲۹)

پس جو چاہے اس ذکر (حق و صداقت) کو یاد کرے.

وہ اس پیغامِ حق و صداقت کی طرف دعوت دینے والوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اس آواز کو دوسروں تک حکمت و موعظت اور دلائل و براہین کی سے رُو سے پہنچائیں.

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۱۶/۱۲۵)

اے پیغمبر! اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ! اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو! اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو! اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو وہ بھی ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ ہو. تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہِ راست پر ہے.

وہ ان کے علم و بصیرت اور دانش و بینش کو اپیل کریں اور اس طرح اُن کے ذہن کو ان حقائق کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ کریں.

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ

وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ (۱۲/۱۰۸)

اے پیغمبر! تم کہہ دو! کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں تمہیں اللہ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں. اللہ بلند و بالا ہے میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں.

جور واکراہ، استبداد ہے

وہ اُمم سابقہ کے احوال و کوائف سے ہمیں بتلاتا ہے کہ متمرد اقوام اور مستبد حکام، حریت فکر د آرار کو سلب کر لیتے تھے اور اپنے تغلب و تسلط کی بنا پر مذہب میں زبردستی کرتے تھے. قوم شعیبؑ کے متعلق فرمایا:-

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ٥ (۷/۸۸)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں (دنیوی طاقت کا) گھمنڈ تھا کہا "اے شعیب! دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی ــــ یا تو تجھے اور ان سب کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکال باہر کریں گے یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے دین میں لوٹ آؤ: شعیب نے کہا کہ اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا ہم اسے جبراً مان لیں؟

اور فرعون کے متعلق متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے کہ جب اس کے مذہبی پیشواؤں نے حق و صداقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے ربِ موسیٰ پر اپنے ایمان کا اظہار کیا، تو اس نے استکبار و فرعونیت سے گرج کر کہا.

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ ...... وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ٥ (۲۰/۷۱ نیز ۲۶/۴۹)

فرعون نے کہا تم بغیر میری اجازت کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں باطل کا علم سکھایا ہے. اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں؟ میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا. پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم دونوں میں سے کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے.

یہی وہ تغلّب واستبداد اور جور و اکراہ تھا جسے مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت ہوتی تھی۔

جبری اقرار، اقرار ہی نہیں ہوتا

اس لئے اسلام کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ دنیا سے جور و استبداد کو مٹا کر، انسانی فکر و آرا کے لئے آزادی کی فضا پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اگر کسی شخص کے گلے پر چھری رکھ دی جائے اور اس سے کفر کا اقرار لے لیا جائے۔ درآں حالیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، تو یہ اقرار اقرار ہی تصور نہیں کیا جائے گا (۱۶/۱۰۶)۔

جب اس قسم کا اقرارِ کفر، اقرار نہیں، انکار ہی ہے۔ تو اس قسم کا اقرارِ ایمان، ایمان کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ وہ تو اس باب میں یہاں تک محتاط ہے کہ جو بدّو مسلمانوں کے اقتدار و سطوت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے، ان سے کہا گیا کہ ہنوز اپنے آپ کو مومن مت کہو صرف یہ کہو کہ تم نے اسلامی نظام کی اطاعت تسلیم کر لی ہے۔ مومن اس وقت کہلا سکو گے جب ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے گا

ارتداد

(۴۹/۱۴)۔ غور کیجئے! کیا اس قسم کے یقین و ایمان کی کیفیت کہ جس میں شک و شبہ کا کوئی شائبہ تک نہ رہے، کبھی جبر سے بھی پیدا ہو سکتی ہے؟ غیر مسلم تو ایک طرف اگر اپنے دین کی صداقت کے متعلق کسی مسلمان کے دل میں بھی شک و شبہ پیدا ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا اور اسے بجبر مسلمان نہیں رکھا جاسکتا۔ یعنی جس طرح اسلام میں داخل ہونے کے لئے انسان کو پوری پوری آزادی حاصل ہے، اسی طرح اس سے نکلنے کے لئے بھی راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اسی لئے قرآن کی رُو سے ارتداد کی کوئی سزا نہیں۔ کسی کو سزا کے ڈر سے مسلمان رکھنے کے کچھ معنی ہی نہیں۔ ڈر سے نہ کسی کو مسلمان کیا جاسکتا ہے، نہ اسے مسلمان رکھا جاسکتا ہے!

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

اور ان تمام تفاصیل کے بعد اس آیۂ مقدسہ کو دیکھئے جو اس باب میں قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے اور جس کی اکیلی شہادت ہر شک و شبہ کو مٹانے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ہے سورۂ بقرہ کی وہ آیت جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ:-

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۲/۲۵۶)

دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں (کیونکہ وہ دل کے یقین و اطمینان سے تعلق رکھتا ہے اور جبر و تشدد سے یقین و اطمینان پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ (اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جونسی راہ چاہیں اختیار کر لیں) پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے۔ (یعنی سرکشی و فساد کی قوتوں سے بیزار ہو جائے اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی) مضبوط شاخ پکڑ لی۔ یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں (وہ جس کے ہاتھ آ گئی وہی گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو، اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ:۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج

پھر یہ جنگ و جدل کیوں؟

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور اس کے بعد ان خیالات کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں جو اس وقت آپ اُفقِ قلب سے اُٹھ کر آپ کی فضائے ذہنی پر چھا رہے ہیں اور بار بار یہ سوال سامنے لا رہے ہیں کہ اگر مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں تھا۔ اور اسلام، امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا مذہب تھا۔ تو پھر یہ تمام سلسلۂ جنگ و جدال اور سرایا و غزوات جن کے تذکرہ سے قرآن کی آیات اور کتبِ تاریخ و سیر کے صفحات بھرے پڑے ہیں، کس لئے تھا؟ حتیٰ کہ متقدمین نے حضورؐ کی سیرۃِ مقدسہ پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ کتبِ سیرۃ نہیں، بلکہ بالعموم مغازی کے نام سے دنیا میں متعارف ہوئیں کہ ان کا بیشتر حصہ غزوات کے حالات پر ہی مشتمل تھا۔ یہ خیالات آپ کے دل میں اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ آپ نے اسلام کو ایک "مذہب" سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اسلام مذہب نہیں، بلکہ "دین" ہے۔ اور مذہب اور دین کے لطیف لیکن نہایت عمیق فرق کو ملحوظِ خاطر نہ رکھنے سے یہ تمام خلفشارِ قلبی اور خلجانِ ذہنی پیدا ہو رہا ہے۔ مذہب (RELIGION)

مذہب اور دین کا فرق

یا دھرم سے مفہوم ہے خدا اور بندے کے درمیان تعلق۔ یہ تعلق ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا انسان کی دنیاوی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کی دنیاوی زندگی یا ہیئتِ اجتماعی کے لئے ایک اور نظام کی ضرورت

ہوتی ہے، جسے دولتی نظام (STATE) یا حکومت کہا جاتا ہے۔ مذہب میں خدا کی حیثیت محض ایک پرستش کی شے (OJECT OF WORSHIP) ہوتی ہے، اور بندے اور خدا کا تعلق، پرستار (WORSHIPER) اور پرستیدہ (WORSHIPED) کا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب کا لفظ تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اور دین اس نظامِ زندگی کو کہتے ہیں جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو۔

انسانی زندگی کے مختلف گوشوں پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے اس کے لئے جو لفظ (دین) استعمال کیا ہے وہ کس قدر جامع اور بلیغ ہے۔

(۱) انسان تمام مخلوقات سے زیادہ نہتا پیدا کیا گیا ہے، اس لئے وہ اپنی حفاظت اور مدافعت کے لئے اجتماعی زندگی کا محتاج ہے۔ اسی لئے انسان کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک مدنی الطبع حیوان (SOCIAL ANIMAL) ہے۔

(۲) یہ اجتماعی زندگی قواعد و ضوابط کی محتاج ہے۔ اس لئے کہ جب انسان اجتماعی زندگی بسر کرے گا تو اس کے افکار و اعمال اور حرکات و سکنات کا اثر اس کی ذات تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ دوسروں کو بھی متأثر کرے گا۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ بلا ضابطہ و قانون اور بغیر آئین و دستور قائم رہ سکے۔

(۳) وہ نظام جس کے تابع انسان اپنی اس ہیئتِ اجتماعیہ کو قائم رکھتا ہے، دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں مملکت (STATE) کہلاتی ہے اور اس نظام کا نام دولتی نظام (STATE OF SYSTEM) رکھا جاتا ہے۔ اس "دولتی نظام" کا عمود یہ ہے کہ ایک مرکزی اقتدار (CENTRAL AUTHORITY) ہو جس سے اس مملکت کی ہیئتِ حاکمیہ قائم رہے۔ اور باقی تمام افرادِ مملکت اس اقتدارِ اعلیٰ کے مطیع و محکوم ہوں۔

(۴) یہ لوگ اس اطاعت و محکومیت کی زندگی کو اس لئے بطیبِ خاطر اختیار کرتے ہیں کہ اس روشِ زندگی کے نتائج ان کے لئے نفع رساں اور منفعت بخش ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے نظام کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل ہوں گے۔

(۱) اقتدارِ اعلیٰ یا ہیئتِ حاکمیہ۔

(۲) افرادِ مملکت کی محکومیت و اطاعت۔

(۳) وہ دستور و آئین جس کی اطاعت کی جائے۔

(۴) اس اندازِ زندگی کے نتائج۔

قرآن اس پورے نظام کا تعارف جس کے اجزار ترکیبی مندرجہ صدر ہیں' دین کی جامع اصطلاح سے کراتا ہے۔ جب سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے اور افراد نے اجتماعی زندگی اختیار کی ہے' انہوں نے تشکیلِ

دولتی نظام

مملکت کے مختلف معیار اور اس کے نظام کی متنوع صورتیں وضع و اختیار کی ہیں۔ ابتدائی زمانہ کے انسان کی قبائلی زندگی اور شخصی حکومت سے لے کر دورِ حاضرہ کی وطنیت اور جمہوریت' آمریت' اشتراکیت' فسطائیت وغیرہ سب مملکت کی مختلف شکلیں اور اس کے نظام کی متنوع صورتیں ہیں۔ یہ شکلیں بے شک مختلف اور یہ صورتیں متنوع ہیں۔ لیکن آپ بغور دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ اختلاف محض قالب و پیکر کا اختلاف ہے' روح اور حقیقت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ایک ہی رہی ہے۔ یعنی انسانوں کی وجہِ جامعیت (تشکیلِ مملکت) کا معیار' نسل اور زبان' رنگ اور وطن کا اشتراک' اور ان کے نظامِ حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ قرآن نے اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کیا کہ یہ وجہِ جامعیت اور

اسلامی نظریہ

یہ معیار و اقدار انسانوں کے خود ساختہ ہیں اور اس لئے باطل۔ مملکت کی تشکیل' ایمان یعنے (IDEOLOGY) کی وحدت پر ہونی چاہیئے! دنیا کے تمام ایسے انسان جو ایک نظریہ حیات اور ایک تصورِ زندگی رکھتے ہیں' ایک قوم کے افراد اور ایک مملکت کی رعایا ہیں اور اس نظریہ حیات اور تصورِ مملکت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ قانون سازی کا حق کسی انسان کو نہیں۔ (انسانوں کے لئے غیر متبدل اصول اور قوانین صرف ذاتِ خداوندی متعین کر سکتی ہے اس لئے اس نظامِ مملکت میں حاکمیت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے اور چونکہ وحدتِ خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے اس لئے اس نظام کی بنیاد عدل پر ہوتی ہے۔ دنیاوی میزانوں میں عدل سے مفہوم ہے قانونِ مروجہ کے مطابق فیصلہ۔ مثلاً جب امریکہ میں شراب نوشی قانوناً ممنوع تھی تو شراب خوار کو سزا دینا مطابق عدل و انصاف تھا۔ اور آج جبکہ قانون انسداد شراب منسوخ ہو چکا ہے۔ تو شراب خوار سے بازپرس نہ کرنا عین مطابق عدل و انصاف ہے اور اسے سزا دینا ظلم و استبداد ——— لہٰذا

عدل سے مفہوم

انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں عدل کی کوئی مطلق (ABSOLUTE) حیثیت نہیں' محض اضافی (RELATIVE) حیثیت ہے لہٰذا جس فیصلہ کو آپ ایک

وقت ہیں عین عدل کہہ رہے ہوں ضروری نہیں کہ وہ فی الواقع عدل پر مبنی ہو۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فیصلہ قانونِ مروّجہ کے مطابق ہے۔ لیکن چونکہ قوانینِ الٰہیہ عدلِ مطلق پر مبنی اور غیر متبدّل ہیں اس لئے ان کے مطابق فیصلے، عدلِ مطلق (ASOLUTE JUSTICE) پر مبنی ہوں گے۔ اس نظام میں عدل سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہر انسان کو اس کی مضمر صلاحیتوں کے نشوو ارتقاء کے وسائل اور مواقع یکساں طور پر میسّر ہوں اور ہر فرد معاشرہ (سوسائٹی) میں وہ مقام حاصل کرلے جس کا وہ اپنی صلاحیتوں کی رُو سے مستحق ہے۔ لہٰذا قرآن نے دنیا کو جس دین سے روشناس کرایا اس کے اجزاء ترکیبی حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ اور منصبِ حاکمیت صرف خدا کو حاصل ہے۔

(۲) تمام افرادِ ملّت خدا کی محکومیت میں یکساں ہیں۔

(۳) اس نظامِ حاکمیت کے اساسی قوانین اور اصول قرآن کے اندر منضبط و محفوظ ہیں۔

(۴) اس نظام کا عملی نتیجہ عدل ہے جس کے بروئے کار لانے کے لئے ہر فردِ مملکت اپنی اپنی جگہ ذمّہ دار ہے اور عدالتِ خداوندی میں جوابدہ۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے الدّین جسے اسلام کہتے ہیں۔ یہی دین حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے شروع سے دیا جاتا رہا۔

حضرات انبیاء کرامؑ اسی دین کو قائم کرنے کے لئے آتے تھے لیکن ان کے بعد ان کی اُمّتیں دین کو مذہب سے بدل دیتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں یہودیوں کے ذہن سے دین کا تصور یکسر محو ہوچکا تھا اس لئے جب آپ انہیں رومیوں کے نظامِ مملکت کے خلاف انقلاب پر آمادہ کرنا چاہتے تھے تو وہ اس تبدیلی میں اپنی مذہبی سیادت کا خاتمہ دیکھتے تھے اسی لئے خود انہوں نے آپ کی دعوت کی مخالفت شروع کردی۔ نبیؐ اکرمؐ اسی دین کو قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے جس کا نام اسلام تھا اور جس کی اصلی صورت یہود و نصاریٰ نے اس درجہ مسخ کر رکھی تھی کہ خود انجیل میں اس قسم کی تعلیم داخل ہوچکی تھی کہ "قیصر کا حصّہ قیصر کو دو اور کلیسا کا حصّہ کلیسا کو" دین اور دنیا کی یہ تقسیم یعنی وحدت کی جگہ ثنویت، دین کو مذہب سے بدل دینے کا نتیجہ تھا۔ مذہب ان کے نزدیک رہبانیت کا نام تھا اور حکومت قیصر کا کام، قرآن ان تمام اختلافات کو مٹانے کے لئے آیا تھا چنانچہ اس نے آکر اعلان کردیا کہ رہبانیت کا تصور ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے، فرمودۂ خداوندی نہیں:۔

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۷)
اور وہ رہبانیت جو انہوں نے خود ہی گھڑ لی تھی ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔

خدا کی طرف سے دین عطا ہوا تھا جس کا نام اسلام ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (۳/۱۸)

بلاشبہ الدّین (یعنی اصلی دین) اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے (اس ایک دین کے سوا اور کوئی دین نہیں) اور یہ جو اہلِ کتاب نے باہمدگر اختلاف کیا تو یہ (اس لئے نہیں ہوا کہ اس دین کے سوا انہیں کسی اور دین کی راہ دکھائی گئی تھی، یا دین کی راہ مختلف ہو سکتی ہے بلکہ) اس لئے کہ علم کے حصول کے بعد وہ اس پر قائم نہیں رہے اور آپس کی ضد اور عناد سے الگ الگ ہو گئے۔ اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے (اور ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتا ہے) تو اللہ کا قانون بھی حساب لینے میں سُست رفتار نہیں۔

اس دین (نظامِ زندگی) کی بنیادی خصوصیت اور اساسی امتیاز یہ ہے کہ اس میں اطاعت و محکومیت خدا اور صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔

اس کی عملی شکل

اس اطاعت اور محکومیتِ خداوندی کی عملی شکل کیا ہے؟

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ع (۱۰/۱۰۹)

(اے پیغمبرِ اسلام) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے اس پر چلتے رہو اور اپنی راہ میں جمے رہو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

عبادت کا مفہوم

اس اطاعت و محکومیتِ خداوندی کو قرآن نے "عبادت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ عِبَادَتْ کے معنی ہی محکومیت اور غلامی کے ہیں۔ اس لئے قرآن کی رُو سے انسان اور خدا کا تعلق محض پرستار و پرستیدہ کا نہیں بلکہ حاکم و محکوم کا ہے۔ وعظِ یوسفی کے ان درخشندہ ٹکڑوں پر غور کیجئے جو زندان کی تاریکیوں میں وجہ نورانی قلب و نظر بنے، یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی۔

فرمایا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) "حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔" اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (۱۲/۴۰) "اس نے حکم دیا کہ محکومیت وعبودیت صرف اسی کی اختیار کرو!" ان دونوں ٹکڑوں کو ملائیے اور دیکھئے کہ عبادت کا صحیح مفہوم کس طرح واضح ہوجاتا ہے۔ سورۂ کہف کے آخر میں فرمایا:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۧ (۱۸/۱۱۰)

(اے پیغمبرِ اسلام!) ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا حاکم وہی ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کے لئے آرزو رکھتا ہو، چاہیئے کہ اچھے کام انجام دے!! اور اپنے پروردگار کی محکومیت واطاعت میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے۔

اور خود اسی سورۃ کے شروع میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ:۔

لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)

وہ اپنی حکومت میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔

ان دونوں آیات کے ربط سے عِبَادَت کے معنی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے عبادت کے معنی پرستش کرنا نہیں بلکہ محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اس سے غور فرمایئے کہ جب ایک عبدِ مومن خدا کے حضور پورے خضوع وخشوع سے اقرار کرتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ "ہم تیری ہی محکومیت اختیار کرتے ہیں" تو کتنے بڑے انقلاب انگیز دعویٰ کا اعلان کرتا ہے۔ عبادت کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر ان آیات پر پھر ایک مرتبہ غور کیجئے جو دِین سے متعلق اوپر درج ہو چکی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کا صحیح مفہوم کس قدر واضح ہوجاتا ہے۔

ذہنِ انسانی کے خود ساختہ تصور کی رُو سے انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ یعنی مذہب وسیاست میں۔ اس کی رُو سے پرستش خدا کی کی جاتی ہے اور محکومیت مملکت کے قوانین کی—!

تفریق مذہب و سیاست

زندگی کی یہی وہ بنیادی تفریق یعنی مذہب وسیاست کی علیحدگی تھی جس نے ظہورِ اسلام کے وقت ساری دنیا میں فسادی فسا

پھیلا رکھا تھا۔ اسی تفریق کو مٹانے کے لئے حضورؐ تشریف لائے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت پر تھی! — سماتی کہاں اس فقیری میں میری

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا — بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنّیدی و اردشیری

یہ تھا وہ دین جسے لے کر حضورؐ مبعوث ہوئے اور ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اللہ کے عہد کو بھلا چکے تھے کہ حکومیت اس کے سوا کسی کی جائز نہیں۔ اور جن اجزاء (مذہب و سیاست) کو ملانے کا اللہ نے حکم دیا تھا اُسے انہوں نے قطع کر رکھا تھا اور اس طرح دنیا میں فساد برپا ہو رہا تھا۔

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ ۪ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (۲/۲۷)

(فاسق کون ہیں؟ فاسق وہ ہیں) جو احکامِ الٰہی کی اطاعت (و محکومیت) کا عہد و میثاق کر کے پھر اسے توڑ دیتے (اس عہد سے پھر جاتے) ہیں اور جن عناصر کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ان کے قطع کرنے میں بیباک ہیں۔ اور اپنی (بداعمالیوں اور سرکشیوں سے) ملک میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔

حکومت اور قوّت

دین کے اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد اب آگے بڑھیئے۔ دنیا میں کوئی نظامِ مملکت قوّت کے بغیر نہ قائم کیا جا سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔ قانون، قانون کی حیثیت ہی اس وقت اختیار کرتا ہے جب اس کے پیچھے قوّتِ نافذہ موجود ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے ان حرارت آمیز اور بصیرت نواز الفاظ میں آشکارا کیا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ............اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۠ (۵۷/۲۵)

(اے افرادِ نسلِ انسانی) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور ان کے ساتھ کتاب (قانون) اور میزان (عدل) نازل کی تھی، تاکہ لوگ عدل و انصاف کو قائم کر سکیں۔ علاوہ بریں ہم نے شمشیرِ فولادی کو نازل کیا جس میں بڑی ہی طاقت اور لوگوں کے لئے بڑی ہی منفعتیں ہیں۔ تاکہ خدا، عملاً جان لے کہ کون بن دیکھے خدا اور اس کے رسول کے (الدین) کی امداد کرتا ہے (اور کون امداد نہیں کرتا) بلاشبہ اللہ بڑی ہی قوتوں کا مالک اور عزت و عظمت والا ہے۔

کتاب (قانون) اس کے ساتھ فولاد (قوّت)، ان دونوں کے امتزاج سے نظامِ مملکت کا قیام ہوتا ہے۔ قانون بلا قوّت، محض ضابطۂ اخلاق رہ جاتا ہے[1]۔ جسے مُلّا اپنے وعظ میں، پنڈت اپدیشں میں اور پادری گرجا کے سرمن (SERMON) میں منتوں اور سماجتوں سے پیش کرتا ہے، اور سامعین لذّتِ تقریر سے بہرہ یاب ہو کر دامن جھاڑ کر اُٹھ آتے ہیں، اور ایسے اجتماعاتِ وعظ و نصائح کو موجبِ خیر و برکت اور باعثِ ثوابِ دارین قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب قوّت کے ساتھ قانون نہیں رہتا تو وہ سرزمین بے آئین، فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

اہلِ حق را زندگی از قوّت است
قوّتِ ہر ملّت از جمعیت است
رائے بے قوّت ہمہ مکر و فسوں
قوّتِ بے رائے جہل است و جنوں

قانون بلا قوّت (یعنی مذہب) میں حق و باطل کا معیار مباحثوں اور مناظروں کے لفظی مجادلات رہ جاتے ہیں اور ہر فریق اپنے اپنے مذہب کو منطقی دلائل و فلسفی براہین سے سچّا ثابت کرنے کی کوشش کرتا

---

[1] اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ کمزور مسلمان سے طاقتور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے۔ (مسلم، کتاب القدر، باب فی الامر والقوۃ)۔

ہے. قرآنِ کریم مستقل اقتدار دیتا ہے اور انہیں نافذ کرنے کے لئے قوّتِ نافذہ کو لاینفک قرار دیتا ہے.

اِستخلاف اس قوّتِ نافذہ کو استخلاف کہتے ہیں جس سے دین متمکّن (ESTABLISHED) ہوتا ہے.

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥ (۲۴/۵۵)

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور (وراثتِ ارض کی) صلاحیت پیدا کرنے والے اعمال کئے' یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم انہیں دنیا میں استخلاف (حکومت) عطا کریں گے. جس طرح ہم نے ان سے پہلوں کو استخلاف عطا فرمایا تھا. اور (یہ وعدہ کیا ہے کہ) بلا شبہ خدا اُن کے اس دین کو ان کے لئے متمکّن (با اقتدار و صاحبِ قوّت) بنا دے گا' جسے خدا نے ان کے لئے پسند فرما لیا ہے. اور نیز خوف کے بعد اُن (کی زندگی) کو امن و سلامتی (کی زندگی) میں تبدیل کر دے گا. تاکہ وہ لوگ میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کریں اور میرے ساتھ (میری اطاعت و محکومیت میں) کسی دوسرے کو شریک نہ کریں. اور جس نے ان تمام باتوں کے باوجود انکار کی راہ اختیار کی تو درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو فسق و فجور پھیلانے والے ہیں.

دیکھئے! دین کے اس تمکّن کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ کہ عبادت (محکومیت) صرف خدا کی رہ جائے اور اس کی حاکمیت میں کسی کی شرکت نہ ہو (يَعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا). اس طرح دنیا میں قانونِ قرآنی کی تنفیذ ہو گی اور اس قوّت پر ہر وقت قانونِ خداوندی کا محاسبہ اور نگرانی ہو گی. قرآن اور شمشیر دونوں لازم و ملزوم ہیں. قرآن کو ایک زندہ و متحرک ضابطہ حیات بنانے کے لئے قوّت' اور قوّت کی نگران قرآن کی تعلیم ؎

این دو قوّت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

یہی وہ قوّت ہے جس کے متعلق سورۂ انفال میں فرمایا.

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ.... (۸/۶۰)

اور جس قدر ان کے مقابلہ کے لئے تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو! اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمۂ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔

جو کچھ یہاں تک لکھا گیا ہے اس سے آپ کا ذہن شاید اس طرف منتقل ہو جائے کہ خدا کی طرف سے جو دین (قرآن میں) دیا گیا ہے اسے بزورِ شمشیر قائم کیا جائے گا۔ یعنی لوگوں کو بجبر مسلمان بنایا جائے گا جیسا کہ پہلے بہ صراحت لکھا جا چکا ہے۔ کسی کو بہ جبر مسلمان بنانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ جسے بہ جبر مسلمان بنایا جائے یا ڈر سے مسلمان رکھا جائے، اسے قرآن مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ قوت کسی کو بہ جبر مسلمان بنانے کے لئے استعمال نہیں ہو گی۔ یہاں سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ قوت استعمال کس مقصد کے لئے کی جائے گی۔ اس کا جواب آئندہ باب میں آپ کے سامنے آئے گا۔
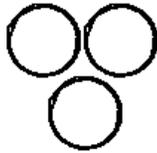
بابُ دوم

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر طائرانہ نگاہ ڈالئے حسبِ ذیل نتائج آپ کے سامنے آجائیں گے.

(۱) انسان مدنی الطبع ہے اس لئے حیاتِ اجتماعی اس کی طرزِ زندگی کا خاصہ ہے.

(۲) حیاتِ اجتماعیہ کی تشکیل و ترتیب کا نام مملکت ہے.

(۳) مملکت کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے.

(۴) اس نظام کا قیام و استحکام قوت پر منحصر ہوتا ہے.

(۵) انسانوں نے جس قدر نظاماتِ مملکت تجویز کئے وہ سب اس اصول پر متضرع ہیں کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی اور حکومت کا حق حاصل ہے.

(۶) انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی اساس مصالح مملکت پر ہوتی ہے، ضابطہ انسانیت پر نہیں.

(۷) ضابطہ اخلاق کا دائرہ مذہب سمجھا جاتا ہے جس کی بنیاد خدا یا کسی اور ہستی کی پرستش پر ہوتی ہے.

(۸) مذہب اور سیاست کو الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے! اور دونوں میں باہمی کوئی تعلق نہیں ہوتا.

(۹) اسلام ایک ایسا نظامِ مملکت پیش کرتا ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کا منصب صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے اور مملکت اس کے قانون کو نافذ کرنے کا ذریعہ اور واسطہ ہوتی ہے.

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ مملکت قائم کیسے ہوگی۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو حقائق پیش کئے جائیں ان پر انسان پورے سکون سے غور و فکر کرے اور جب اس کا دل و دماغ انہیں علیٰ وجہ البصیرت صحیح تسلیم کرے تو وہ ان حقائق کی صداقت کا اقرار کرے اور انہیں اپنی زندگی کا نصب العین بنالے۔ اس طرح قرآنی حقائق پر ایمان لانے والے' ایک جماعت بنانے جائیں گے۔ اور یہی جماعت جب وسیع ہو جائے گی تو وہ اپنے لئے ایک مملکتی نظام وضع کرلے گی جس میں وہ حقائق جن پر اس کے افراد' علیٰ وجہ البصیرت ایمان لائے ہیں' ان کی عملی زندگی کا ضابطہ بن جائیں گے۔ یعنی وہ قوانین و دستور کی شکل اختیار کر لیں گے آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں تک قوت کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ظاہر ہے کہ مملکت کوئی بھی ہو' اس میں مجرمین کو قانون کے مطابق چلانے کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ وہ پہلا مقام ہوگا جہاں اس مملکت کو قوت کی ضرورت پڑے گی۔

یہ بھی واضح ہے کہ اس مملکت میں غیر مسلم بھی آباد ہوں گے جن کے مال' جان' عصمت' مذہب' معابد کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ اس حفاظت کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مملکت کے خلاف سازش کریں' تو اس کی مدافعت کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہوگی۔

نیز' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسری مملکتیں اس جدید مملکت کی تشکیل میں مزاحمت کریں یا اس کے متشکل ہو جانے کے بعد' اس کی تخریب کی کوشش کریں۔ ان کے ان جارحانہ اقدامات کو روکنے کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہوگی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ان مملکتوں کے درمیان جنگ تک بھی نوبت آجائے گی۔

جہاد و قتال

یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہے کہ قرآنی مملکت کے قیام' استحکام اور بقا کے لئے مسلسل جدّ و جُہد کی ضرورت ہے۔ اور اس جدّ و جہد میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے' جہاں جنگ بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اس مسلسل جدّ و جہد کے لئے جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے' اور جنگ کے لئے قتال کا۔ اس سے واضح ہے کہ اگرچہ قتال بھی جہاد کا ایک گوشہ ہے۔ لیکن ہر جہاد (کوشش) قتال (جنگ) نہیں۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے والے (دانستہ یا نادانستہ) جہاد کو قتال (جنگ) ہی کے معنوں میں لیتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم میں جہاد کی بڑی تاکید

آئی ہے ــــ بلکہ یوں کہیئے کہ مومن کی ساری زندگی جہاد ہی سے عبارت ہے ــــ اس لئے وہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ دیکھئے قرآن قدم قدم پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم میں سب سے پہلی مرتبہ قتال کی اجازت کہاں آئی ہے. نبیٔ اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز مکہ میں کیا اور وہاں جماعت کی تشکیل کی ابتداء کی. اس میں قوت کے استعمال کا کوئی سوال نہیں تھا. دین کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کیا جاتا تھا اور جو اسے قبول کرتا تھا، کامل غور و خوض کے بعد، دل کے پورے سکون اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ قبول کرتا تھا. قریش کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ حتیٰ کہ جب اس مخالفت کی انتہا ہوگئی تو حضورؐ مدینہ کی طرف ہجرت کرکے آگئے، جہاں کی فضا دین کی اقامت کے لئے زیادہ سازگار تھی. لیکن قریش نے ان کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور ایک لشکرِ جرّار لے کر مدینہ کی طرف چڑھ دوڑے. اب وہ وقت آگیا تھا کہ مجاہدین کی یہ جماعت یا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی یا میدانِ جنگ میں نکل کر اپنی بقا کے لئے آخری کوشش کر دیکھتی اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت دی کہ وہ میدانِ جنگ میں آکر مقابلہ کریں. یہ ہے پہلا موقعہ جہاں انہیں جنگ کی اجازت دی گئی. سورۃ حج میں ہے ؛۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ .. .. .. (۲۲/۳۹-۴۰)

جن (مومنوں) کے خلاف سرکش قوتیں جنگ کے لئے چڑھ آئی ہیں اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے. یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ان کا جُرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

اور اس کے بعد ہے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۲/۴۱)

(یہ مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحبِ اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ صلٰوۃ کا نظام قائم کریں گے۔ نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے۔ ان کے تمام امور کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ جماعتِ مومن کو میدانِ جنگ میں جانے کی سب سے پہلی اجازت کس وقت اور کن حالات میں دی گئی تھی؟ اس اصول کو ہمیشہ سامنے رکھئے کہ اسلام، دنیا میں مذہبی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ دنیا کی ہر ملت کو مذہبی آزادی دیتا ہے اور ان کی اس آزادی کے تحفظ کو جماعتِ مومنین کا فریضہ سمجھتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب وہ ساری دنیا کی قوموں کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے تو وہ اپنی آزادی کو بھی برقرار رکھنا اپنا حق سمجھتا ہے۔

تلوار کب اُٹھے گی

دیگر اہلِ مذاہب کے نزدیک مذہبی آزادی سے مقصود پوجا پاٹ اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کی آزادی ہے اور بس۔ مسلمان یہ آزادی ہر ایک کو دیں گے۔ لیکن ان کے نزدیک "مذہبی آزادی" یہیں تک محدود نہیں۔ یہ تو ان کے "مذہب" کا ایک گوشہ ہے۔ ان کا دین انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس لئے ان کے ایمان کے مطابق "مذہبی آزادی" سے مفہوم ان کے نظامِ مملکت کی آزادی ہے۔ یہی ان کا دین ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس نظامِ مملکت کے قیام میں مانع آئیں گے یا اس کی تخریب کے ارادے کریں گے، مسلمان ان کی ان کوششوں کو روکے گا اور بروئے کار نہیں آنے دیں گے۔ وہ انتہائی کوشش کرے گا کہ باہمی افہام و تفہیم اور صلح صفائی سے معاملہ صاف ہو جائے اور مستبد و سرکش قوتیں اپنی حیلہ کاریوں اور متمردانہ درازدستیوں سے باز آ جائیں لیکن اگر وہ اپنی قوت کے نشہ میں حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہو جائیں اور انسانیت کا کوئی جذبہ ان میں باقی نہ رہے تو پھر مسلمان جاں بکف میدان میں آ جائے گا اور یا اپنی دینی آزادی کو حاصل کر لے گا یا اپنے خون کا آخری قطرہ تک دے دے گا کہ اس کے نزدیک حق و صداقت کی مدافعت میں جان دے دینا غیر اللہ کے نظام میں زندگی بسر کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

مردِ مومن انسانی غلامی (طاغوتی نظام) کی ناساعد فضا میں سانس نہیں لے سکتا، خواہ اس میں دنیاوی معیار و میزان کی رُو سے کتنا ہی امن کیوں نہ ہو۔ اس کے نزدیک امن اور فساد کی تعریف ہی اور ہے۔ اگر کوئی حکومت، اپنی قوت کے زور سے قزاقی، اور رہزنی، لوٹ اور غارت گری کو دبا دیتی ہے اور لوگ حفاظت سے اپنے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں اور بے خوف و خطر اِدھر اُدھر سفر کر سکتے ہیں تو اسے پُر امن حکومت کہا جائے گا جس کے عہدِ زرّیں میں کہیں فتنہ و فساد دکھائی نہیں دے گا۔ قرآن بیشک اس قسم کی بدامنی کا استیصال چاہتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے آگے بھی جاتی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی امن و سلامتی یہ ہے کہ محکومیت صرف خدا کے لئے ہو جس میں انسانوں کو اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں فلاح و سعادت نصیب ہو۔ اس کے نزدیک یہی نظامِ مملکت حق ہے۔ اس کے سوا تمام نظامات باطل (طاغوتی) ہیں اور جب حق باطل کے تابع ہو جائے (یعنی نظامِ مملکت غیر اللہ کا ہو) تو اس کا نام فساد ہے، خواہ اس میں بظاہر کیسا ہی امن کیوں نہ ہو؟ اسی لئے وہ برملا کہتا ہے کہ

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (۲۳/۷۱)

اگر ایسا ہوتا کہ حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگ جاتا تو یقیناً آسمان و زمین اور مافیہا سب میں فساد برپا ہو جاتا۔ ہم جو ان سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ حق کو انسانوں کے خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے تو اس میں خود ان کے شرف کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن ان کی غلط نگہی کا کیا علاج کہ یہ لوگ خود اپنے شرف و تکریم سے مُنہ موڑ رہے ہیں۔

اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ع (۴/۷۶)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں تو ان کا لڑنا اللہ کے لئے ہوتا ہے (کیونکہ وہ حکومتِ خداوندی

کے قیام کی خاطر لڑتے ہیں) اور جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی وہ طاغوت کی راہ میں
لڑتے ہیں (یعنی غیر خدائی نظام کے قیام کی خاطر) سو (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو چاہیئے کہ)
شیطان کے حمائتیوں سے لڑو (اور ان کی طاقت وکثرت کی پرواہ نہ کرو!) شیطانی مکر
(دیکھنے میں کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو لیکن حق کے مقابلہ میں) کبھی جمنے والا نہیں۔

یہاں مومن اور کافر کی تمیز غور طلب ہے۔ سبیل اللہ (حق کی راہ) یعنی حکومتِ خداوندی کے قیام (دین)

اِذنِ قتال

کی خاطر لڑنے والے مومن — اور اس نظام کے علاوہ کوئی نظام ہو اُسے قائم کرنے والے کافر۔ لہٰذا وہ لوگ جو دین کے قیام میں مانع آئیں اور اس کی تخریب و استیصال کے ارادے کریں، اور اُن کے اِن ارادوں کی روک تھام کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے، تو اس مقام پر جماعتِ مومنین کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ یہی وہ حالات تھے جن کے ماتحت مسلمانوں کو پہلے پہل شمشیر بے نیام کرنے کی اجازت ملی تھی۔ ایک مرتبہ اس اِذنِ قتال کی آیت پر پھر غور کر لیجئے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

(۲۲/۳۹ — ۴۰)

جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے، اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں، ان کا کوئی جرم نہ تھا، اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور دیکھو! اگر اللہ بعض جماعتوں کے ہاتھوں دوسری جماعتوں کی مدافعت کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لئے بے روک چھوڑ دیتا)، تو کسی قوم کی عبادت گاہیں زمین پر محفوظ نہ رہتیں۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں، جن میں اس کثرت کے ساتھ

اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ (یاد رکھو!) جو کوئی اللہ کے قانون کی حمایت کرے گا، ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرماتے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے۔

اس کی تفصیل و وضاحت دیگر مقامات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۲/۱۹۰﴾

جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں چاہیئے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی ان سے لڑو! (پیٹھ نہ دکھلاؤ) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہ کرنا چاہیئے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے!

وَ قٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ؕ فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲/۱۹۳؛ ۸/۹﴾

اور دیکھو ان لوگوں سے جنگ جاری رکھو، یہاں تک کہ فتنہ (یعنی ظلم و فساد) باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ (انسانی ظلم و استبداد کی مداخلت اس میں باقی نہ رہے) پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ جنگ سے باز آ جائیں تو (تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیئے کیونکہ) جنگ کی اجازت تو صرف ان ہی لوگوں کے مقابلہ کے لئے دی گئی تھی جو ظلم و زیادتی کرتے تھے۔

اب آگے بڑھئے! جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کریم دنیا میں مذہبی آزادی کا سب سے بڑا علمبردار اور ضامن ہے۔ مذہبی آزادی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر مذہب اپنی اپنی تبلیغ و اشاعت کر سکے بشرطیکہ اس میں وہ دوسرے اہل مذاہب کے جذبات کا پورا پورا احترام کرے اور اس تبلیغ کو اپنی سیاسی اغراض کے حصول کے لئے سپر نہ بنائے۔ نہ ہی اس کے لئے کوئی فریب کارانہ ذرائع اختیار کرے۔ قرآن کریم اس قسم کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی اپنے متبعین کے لئے بھی چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے

"مملکتِ اسلامیہ" دوسری اقوام کے ساتھ امن و سلامتی کے معاہدات کرے گی. اور پھر جو قوم ان معاہدات کو توڑے گی ان سے بعض حالات میں جنگ ناگزیر ہو جائے گی. معاہدات کا احترام قرآن کی اساسی تعلیم میں سے ہے. وہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو انسانیت کی بارگاہ کا سنگین مجرم قرار دیتا ہے. وہ یہود کے خلاف یہ الزام عاید کرتا ہے (اور تاریخ اس پر شاہد ہے) کہ وہ ہمیشہ عہد شکنی کرتے تھے.

معاہدات کا احترام

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۱۰۰)

(اور یہ لوگ جو آج دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں تو غور کرو!) اس سے پہلے ان لوگوں کی روش کیسی رہ چکی ہے! جب کبھی ان لوگوں نے کوئی عہد کیا تو کسی نہ کسی گروہ نے ضرور ہی اسے پسِ پشت ڈال دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خدا کی صداقتوں سے انکار کرتے ہیں.

اسی طرح وہ کفار کی عہد شکنی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے.

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ (۹/۱۰)

کیا ہی برا ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں. کسی مومن کے لئے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں، نہ عہد و اقرار کا. یہی لوگ ہیں کہ ظلم میں حد سے گزر گئے ہیں.

ان کے برعکس وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ (۲/۱۷۷)

جب وہ کسی سے عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں.

أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۚ (۵/۱)

اپنے عہد و پیمان کی پابندی کرو.

اس نظام کا گویا اساسی آئین ہے اور اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ

أَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (۱۷/۳۴)

عہد پورا کرو! اس لئے کہ یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہونے والا۔ اس کے متعلق تم اپنے خدا کے ہاں جواب دہ ہوں گے۔ کیونکہ جب تم کسی سے معاہدہ کرتے ہو تو یوں سمجھو کہ اس میں اللہ کو ضامن قرار دیتے ہو۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

(۱۶/۹۱)

اور جب تم آپس میں معاہدہ کرو تو (سمجھ لو کہ یہ اللہ کے نزدیک عہد ہو گیا تو) چاہیئے کہ اللہ کا عہد پورا کرو! اور ایسا نہ کرو کہ قسمیں پکی کر کے انہیں توڑ دو۔ حالانکہ تم اللہ کو اپنے اوپر نگہبان ٹھہرا چکے ہو۔ یقین کرو کہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا علم ہر بات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

احترامِ عہد کی بلندیاں

اس باب میں قرآن انسان کو ایسے بلند مقام پر لے جاتا ہے کہ جب نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو محوِ حیرت رہ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کسی قوم سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے اور کسی معاملہ میں وہاں کے مسلمان تمہیں مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ تو تم اپنے معاہدہ کے خلاف ان مسلمانوں کی مدد کبھی نہیں کر سکتے کہ یہ بھی عہد شکنی میں داخل ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۸/۷۲)

اور جن لوگوں کا حال ایسا ہو کہ ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی، تو تمہارے لئے ان کی امداد و رفاقت میں سے کچھ نہیں جب تک وہ اپنے وطن سے ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے اِلّا یہ کہ کسی ایسے گروہ کے مقابلہ میں مدد چاہیں۔ جس سے تمہارا (صلح و امن کا) عہد و پیمان ہے (کہ اس صورت میں تم عہد و پیمان کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتے) اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔

جب تک فریقِ مخالف عہد نبھاتا جائے مسلمانوں کے لئے عہد و معاہدہ کی پابندی ضروری[1] ہے۔

دھوکہ نہیں دیا جا سکتا

البتہ جب ان کی طرف سے نقضِ عہد کا اندیشہ ہو تو انہیں ان کا عہد واپس دیا جا سکتا ہے، دھوکے سے عہد شکنی پھر بھی نہیں کی جا سکتی۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۝ (۸/۵۸)

اور کسی قوم سے تمہیں خیانت کا خدشہ ہو تو چاہیئے کہ ان کا عہد ان پر لوٹا دو! (یعنی عہد فسخ کر دو!) اس طرح کہ دونوں جانب یکساں حالت میں ہو جائیں (یعنی ایسا نہ کیا جائے کہ اچانک شکستِ عہد کی انہیں خبر دی جائے بلکہ پہلے سے جتا دیا جائے، تاکہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر تیاری کی مہلت مل جائے) یاد رکھو! اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اس تعلیم پر غور فرمائیے اور پھر اس کا مقابلہ کیجئے سیاسی دنیا کے مسالک و مشارب سے، بیّن فرق آپ کے سامنے آجائے گا۔ دنیائے قدیم کے مقنّن (سولن) کے نزدیک "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے ہاتھوں فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔" دنیائے جدید کی سیاست کا امام اطالوی مدبّر میکیاولی (MACHIAVELLI) ہے جس کا ضابطۂ سیاست تمام مغربی اقدار کا عروۃ الوثقٰی ہے۔ سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

بادشاہ کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اسلئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن مصالح کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہے تو اس معاہدہ کو بلا تأمل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب

---

[1] سننِ ابنِ ماجہ کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کی امان دی اور پھر اُسے قتل کر ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔

دلائل پہلے سے تلاش کرلے۔ (THE PRINCE; CHAP - 18)

میکیاوَلی کا فلسفہ وہ بنیاد ہے جس پر مغرب کی تمام سیاست و تمدن کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ آپ میکیاوَلیؒ کے محوّلہ بالا اقتباس کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ آج دنیا کی اتنی اتنی بڑی قوموں میں جو تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کی اجارہ داری اور عدل و انصاف کے ضامن ہونے کی مدّعی ہیں معاہدات و بثاقات کی کس طرح مٹی پلید ہوتی ہے۔ جس دیدہ دلیری سے یہ اکابرینِ اقوام اپنے وعدوں سے مکر جاتے ہیں اُسے دیکھ کر شرم کی نگاہیں جُھک جاتی ہیں اور حیاء کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے۔ لیکن یہ تمدن و تہذیب اور عدل و انصاف کے ستون ہیں کہ صبح کی بات سے شام کو مکر جاتے ہیں اور شام کے عہد سے صبح کو۔ اور اس میں نہ کوئی جھجک محسوس کرتے ہیں نہ تأمّل۔ اور ویسے کے ویسے معتبر بنے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ جھجک و تأمّل تو اس صورت میں ہو جب ان کے سینے میں جھوٹ اور سچ کی کشمکش کا ہیجان متلاطم ہو۔ وہ اپنے ضابطۂ سیاست میں اس قسم کی عہد شکنی اور دروغ بافی کو عیب ہی نہیں سمجھتے تو پھر حجاب و تکلّف کیسا اور ملامت و سرزنش کس کی؟ میکیاوَلی سیاست کا اصل الاصول یہ ہے کہ اخلاقی اصولوں کو سیاست سے بالکل الگ رکھنا چاہیئے۔ اور سیاست میں صرف اس امر کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ تمہیں کامیابی کس طرح حاصل ہوسکتی ہے اور بس![2] (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED) اس "پیامبرِ سیاستِ ابلیسیہ" کا فرمان ہے جس پر اس کی اُمّت نہایت شدّت سے عمل پیرا ہے۔ اور اس طرح خود بھی تباہی اور ہلاکت کے جہنم میں گرفتار ہے اور باقی دنیا کو بھی اپنے ساتھ اس قعرِ مذلت میں لے ڈوبی ہے۔ جب قرآن کی اس بصیرت افروز

---

[1] قدیم ہندوستان کی سیاست میں صرف ایک مدبّر کا ذکر ملتا ہے جو (KAUTILYA) کے نام سے پکارا جاتا ہے ——— (NARAYAN CHANDRA BANDYOPADHOYA) نے اس کی کتاب ارتھ شاستر کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے وہ اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ کاٹلیا کے لفظی معنے "فریب کار" ہیں (SPALDING) نے اپنی کتاب (CIVILISATION IN EAST AND WEST) میں اس کے اصولِ سیاست کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اسے ہندوستان کا "میکیاوَلی" کہہ کر پکارا ہے۔ اس کے اصولِ سیاست بھی بالکل میکیاوَلی کے سے ہیں اور وہ بھی عہد و معاہدہ کو وقتی مصالح کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور ان سے بلا توقف پھر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

[2] مقصد کی کامیابی کے لئے جائز و ناجائز جو ذرائع بھی استعمال کرو سب جائز ہیں۔

اور عدل پرور تعلیم کو عمل میں لایا گیا تو اس وقت معاہدات کی پابندی کس شدت سے ہوتی تھی، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف یہ حقیقت سامنے لائی جارہی ہے کہ اسلامی نظامِ مملکت غیر اقوام سے معاہدات کرے گا اور ان کا احترام اس پر لازم ہو گا۔ لیکن جو قوم عہد شکنی کرے گی اس سے تصادم ضروری ہو گا۔ یہ جنگ کی تیسری شکل ہو گی۔ نبی اکرمؐ نے مخالفینِ عرب سے معاہدات کئے۔ لیکن انہوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور انہیں بار بار توڑا۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ۝ (۸/۵۵-۵۶)

بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ (انسان ہیں) جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی ایمان لانے والے نہیں۔ اے پیغمبر! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تم سے (صلح کا) عہد و پیمان کیا تھا پھر انہوں نے اسے توڑا اور ایسا ہوا کہ ہر مرتبہ عہد کر کے توڑتے ہی رہے اور وہ (بدعہدی کے نتائج سے) ڈرتے نہیں۔

لہٰذا ان سے جنگ ناگزیر تھی۔ سورۂ توبہ کا پہلا اور دوسرا رکوع دیکھئے۔ ان مخالفین کی عہد شکنی اور معاہدات فراموشی کی تفاصیل آپ کے سامنے آجائیں گی۔ ہنگامی معاہدات تو ایک طرف، اسلام دشمنی میں وہ ان عہد و قیود کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے جو ان کے ہاں بطور قومی شعار صدیوں سے (CONVENTIONALLY) چلے آتے تھے اور جن کی پابندی ان کا ملّی شعار تھا۔ انہوں نے چار مہینے حرمت کے مقرّر کر رکھے تھے۔ جن میں جنگ و جدال اور حرب و ضرب کا سلسلہ از خود ملتوی ہو جاتا تھا اور ہر شخص بے خوف و خطر نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ وہ باہمی جنگ و پیکار میں ان مہینوں کی حُرمت کا خاص خیال رکھتے تھے قرآن نے بھی ان مہینوں کی حُرمت کو برقرار رکھا اور اس کی پابندی کی تاکید کی۔ لیکن مخالفین کی عہد شکنی کا یہ عالم تھا کہ ان مہینوں میں بھی ردّ و بدل کر دیتے تھے اور اس طرح فریب دے کر جنگ سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

کفّار کی عہد شکنی

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ۖ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۹/۳۷)

نسی (یعنی مہینہ کو اس کی جگہ سے پیچھے ہٹا دینا جیسا کہ جاہلیت میں دستور ہو گیا تھا) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کفر میں کچھ اور بڑھا دینا ہے۔ اس سے کافر گمراہی میں پڑتے ہیں۔ ایک ہی مہینہ کو ایک برس حلال سمجھ لیتے ہیں (یعنی اس میں لڑائی جائز کر دیتے ہیں) اور پھر اسی کو دوسرے برس حرام کر دیتے ہیں (یعنی اس میں لڑائی ناجائز کر دیتے ہیں) تاکہ اللہ نے حرمت کے مہینوں کی جو گنتی رکھی ہے اسے اپنی گنتی سے مطابق کر کے اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیں۔ ان کی نگاہوں میں ان کے بُرے کام خوشنما ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ (کا قانونِ مکافات) منکرینِ حق پر (کامیابی و سعادت) کی راہ نہیں کھولتا۔

یہ معاہدہ شکنی کی بدترین شکل تھی اس لئے قرآنِ کریم نے اسے "زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ" کہا ہے۔

مظلوم کی مدد کے لئے جنگ

اب اور آگے بڑھئے! جن غیر مسلم علاقوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہو گی وہاں لوگ اسلام قبول کریں گے۔ اگر ان پر کوئی قوم دست درازی کرے گی تو اسلامی مملکت پر ان کی امداد بھی فرض ہو گی۔ ایسے موقع پر اگر صلح و آشتی اور عہد و معاہدہ سے بات نہ سُلجھے تو ان مظلومین کی حفاظت اور ان پر ظلم و تشدد کی مدافعت میں جنگ لازم آئے گی۔ سورۃ نساء میں ہے:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵)

اور مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے؟ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آ کر) فریاد کر رہے ہیں خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم و تشدد پر کمر باندھ لی ہے، نجات دلا!

(یعنی اہلِ مکّہ سے نجات دلا) اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے۔

مظلوموں کی یہ امداد اس لئے ہے کہ اگر مفسدین کو ان کے ظلم و استبداد سے نہ روکا جائے تو کسی کمزور کو جینے کا حق ہی نہ رہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ کَبِیْرٌ ؕ (۸/۷۳)

یاد رکھو! یہ کفر و سرکشی اختیار کرنے والے سب ایک دوسرے کے رفیق اور کارساز ہیں۔
اب اگر تم مظلوموں کی امداد کے لئے نہ اُٹھے، تو دنیا میں بڑا فتنہ و فساد رونما ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ اگرچہ یہ آیات مکّہ کے مظلومین کے ضمن میں آئی ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مظلوم کی آواز کہیں سے اُٹھے خدا کے یہ سپاہی، بلاتمیز مذہب و ملّت اور بلالحاظِ رنگ و وطن محض حق کی امداد کی خاطر، ان مظلومین کی آواز پر لبیک کہیں گے اور ان کی حفاظت میں اپنی جان تک دے دینگے۔ اس لئے کہ ان کا فریضہ حیات احترامِ انسانیت ہے۔ اگر کمزور کی امداد کے لئے کوئی بھی نہ اُٹھے، تو دنیا اس طرح درندوں کا بھٹ بن جائے جس طرح آج اقوامِ مغرب کی چیرہ دستیوں سے بن رہی ہے کہ زیردست کے لئے خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر امن کا کوئی گوشہ اور عافیت کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہی وہ کمزور کی مدافعت ہے جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی اس آیتِ مقدسہ کے اجمال میں پوشیدہ ہے کہ

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲/۲۵۱)

حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ سے دوسرے گروہ کو ظلم و سرکشی سے ہٹاتا رہتا تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا (اور امن و عدالت کا نام و نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ اہلِ عالم کے لئے فضل و رحمت ہے (اور یہ اس کا فضل ہے کہ مستبدین کی سرکوبی کے لئے دوسرا گروہ تیار ہو جاتا ہے)۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگر سڑک پر دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو پولیس کا سپاہی انہیں گرفتار کر کے عدالت میں لے جائے گا اور وہاں جو بھی ظالم قرار پائے گا سزا بھگتے گا۔ یہ دو افراد

کا معاملہ تھا۔ لیکن اسی طرح اگر دو اقوام ایک دوسرے سے اُلجھ جائیں تو کہیئے کہ وہ کونسی پولیس ہے جو انہیں ماخوذ کرے گی اور وہ کون سی عدالت ہے جہاں ان پر مقدمہ چلے گا اور زیادتی کرنے والی قوم اپنے جُرم کی سزا پائے گی؟ دنیا میں آج جس قدر فساد نظر آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ

حکم بننے والی جماعت

اقوامِ عالم میں نہ کوئی پولیس ہے جو باہمی لڑنے جھگڑنے والی قوموں کو گرفتار کر سکے اور نہ کوئی عدالت جہاں سے زیادتی کرنے والی قوم کو سزا مل سکے۔ پہلی جنگ کی تھکی ہوئی قوموں نے "لیگ آف نیشنز" کے نام سے اسی قسم کے احتساب اور عدل کا محکمہ قائم کیا تھا۔ لیکن چونکہ نیتیں سب کی خراب تھیں، اس لئے نتیجہ ظاہر تھا چنانچہ اس "جمعیتِ اقوام" کا وہی حشر ہوا جو بقول علامہ اقبالؒ "کفن دزدوں" کی جماعت کا ہوا کرتا ہے۔ اب دوسری جنگ کے بعد اسی روح کو دوسرا پیکر دیا گیا ہے اور جمعیتِ اقوام کی جگہ اقوامِ متحدہ (UNITED NATION) کا وجود عمل میں آیا ہے۔ چونکہ یہ عمارت بھی ان ہی کج بنیادوں پر استوار کی گئی ہے اس لئے اس کے انجام کی پیش گوئی کے لئے بھی کسی علمِ غیب کی ضرورت نہیں۔ صرف قرآنی فراست کی ضرورت ہے۔ دنیا میں اس قسم کی جماعت کے وجود کا نظریہ قرآن ہی کا عطا کردہ ہے۔ یورپ نے یہ تصور تو وہاں سے لے لیا۔ لیکن وہ اس رُوح کو کہاں سے لیتا جس کے پیکر کا نام ایسی جماعت ہوتی ہے، وہ روح صرف قوانینِ خداوندی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور مغرب کی اہرمنی سیاست میں خدا کے نام سے چڑ ہے۔ اس لئے طاغوتی روح کا پیکر وہ نتائج کس طرح پیدا کرے گا؟ قرآن، دنیا میں جماعتِ مومنین (حزب اللہ) کا یہ فریضہ بھی قرار دیتا ہے کہ وہ اقوامِ عالم کے تنازعات و مناقشات میں حَکَم بنیں، تمام فیصلے عدل و انصاف سے کریں اور جو اس فیصلہ سے سرتابی کرے اور دنیا میں فساد برپا کرنا چاہے اس کا سر کچل کر رکھ دیں۔ کہ — اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ — چنانچہ اس نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۚ (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امّت بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کرو اور تمہارے اعمال کی نگرانی تمہارا رسول (مرکزِ ملّت) کرے۔

قرآنِ کریم میں دوسروں سے جنگ کی یہی شکلیں ہیں۔ ان کے علاوہ دو ایک صورتیں اور بھی ہیں لیکن

وہ اس نظامِ مملکت کے داخلی انتظامات سے متعلق ہیں۔ قرآن اس کی تو اجازت دیتا ہے کہ اگر کسی شخص کا دل اس نظام کی صداقت (ایمان) سے منحرف ہو گیا ہے تو وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلے لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ جماعت کے اندر رہتے ہوئے اس کے فیصلوں سے سرکشی اختیار کی جائے نظامِ مملکت کے فیصلوں کی حیثیت قانون کی ہوتی ہے۔ اور قانون کی اطاعت لازمی۔ اگر قانون کا اتباع

باغیوں کی سزا

بھی افراد کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور انہیں کھلی چھٹی ہو کہ جب جی چاہے ان سے انحراف کرلیں تو ایسا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ نظام کے بقا کا راز اس کے قانون کی اطاعت میں ہے ــــ نظام کے فیصلوں کی خلاف ورزی کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اس قانون کو تو صحیح تسلیم کرے لیکن اس سے اس کی خلاف ورزی ہو جائے۔ اسے ملزم قرار دیا جائے گا اور جرم ثابت ہونے پر وہ اس کی سزا پائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف بغاوت کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اسے قرآن نے "خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ" سے تعبیر کیا ہے اور اس کی سخت سزا بتائی ہے (اس کی سزا سخت ہونی بھی چاہیئے)۔ سورۂ مائدہ میں ہے:۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ ......
ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۵/۳۳)

بلاشبہ ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسولؐ (یعنی مملکتِ اسلامیہ) سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے تگ و تاز کرتے ہیں، یہ سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیئے جائیں (یا اُلٹی ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنائی جائیں) یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا ان کے لئے مناسب ہو دی جائے) یہی لوگ ہیں جن کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے سخت ترین عذاب ہے!

ایک شکل جو اس سے کہیں زیادہ سنگین اور نتائج کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر تباہ کُن ہے، یہ ہے کہ بظاہر جماعت

منافقت

کے ساتھ ہوں، اس کے فیصلوں کے سامنے تسلیم خم کئے نظر آئیں لیکن در پردہ اس کی تخریب اور بربادی کی کوششیں کریں، اور اس کے لئے غیروں سے سازباز

شروع کردیں۔ اس کا نام منافقت ہے۔

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ ان لوگوں کو سمجھانا چاہیئے کہ وہ اس روش کو چھوڑ دیں۔ وہ یا تو دل کی رضامندی سے اسلام قبول کریں اور یا پھر کھلے بندوں اس سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کریں لیکن اگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنی ان سازشوں سے باز نہ آئیں تو پھر جس طرح کھلے مخالفین کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح ان کے خلاف بھی جنگ کرنے کو کہا گیا ہے۔ کوئی مملکت اپنے اندر اس قسم کے عناصر کو برداشت کر ہی نہیں سکتی۔ ارشاد ہے:۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (۹/۷۳) نیز دیکھئے ۶۶/۹)

اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ! (کیونکہ کافروں کی عہد شکنیاں اور منافقوں کی سازشیں اب آخری درجہ تک پہنچ چکی ہیں) بالآخر ان کا ٹھکانا تباہی و بربادی کا جہنم ہے (اور جس کا ٹھکانا جہنم ہو) تو کیا ہی بُری لوٹنے کی جگہ ہے۔

جنگ ختم کرنے کے لئے جنگ

یہ ہیں وہ صورتیں جن میں قرآن کریم نے جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ اجازت بھی اس لئے تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ (۴۷/۴)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جب تمہارا ان لوگوں سے مقابلہ ہو جنہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا ہے تو ان کی گردنیں ماردو (انہیں قتل کر ڈالو) حتّٰی کہ جب تم انہیں اچھی طرح قتل کر چکو (اور وہ شکست خوردہ ہو کر بھاگنے لگیں) تو ان کو مضبوطی سے باندھ لو (گرفتار کر لو) پھر اس کے بعد یا انہیں احسان رکھ کر چھوڑ دو یا زرِ فدیہ لے کر آزاد کر دو (جنگ کے قیدیوں کے سلسلہ میں یہی دو صورتیں جائز ہیں) حتّٰی کہ خود جنگ اپنے ہتھیاروں کو رکھ دے (ختم ہو جائے)۔

باب سوم

گذشتہ باب میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ وہ کون سے ناگزیر حالات ہیں جن کے ماتحت قرآنِ کریم جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اس موضوع کا ایک پہلو اور بھی ہے جسے سامنے لانا ضروری ہے۔

جنگ کے خلاف اُصولی اعتراضات

کہا یہ جاتا ہے کہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں جنگ بہرحال اور بہر نوع وحشت اور بربریت کا مظاہرہ ہے۔ اور اسے کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ "جنگل کا قانون" ہے اور انسان کے اس عہدِ جہالت و سبعیت کی یادگار ہے جب تنازعات کے فیصلے دلائل و براہین اور دانش و بینش کی بجائے بہیمانہ قوت (BRUTAL FORCE) کی رُو سے ہوا کرتے تھے۔ اس لئے علم و عقل اور تہذیب و تمدن کے دَور میں اسے اضطراراً بھی جائز نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ انسانیت سے گرا ہوا فعل ہے کہ کسی انسان سے کوئی بات قوت اور زور سے منوائی جائے۔ جب انسان کو عقل و تمیز کا شرف عطا ہوا ہے تو اس کے اختلافات و تنازعات افہام و تفہیم سے کیوں نہ طے کر لئے جائیں؟ جنگ و جدل وحشیانہ فعل ہے۔ پیار، محبت، صلح، آشتی، رحمدلی، شانتی، یہ انسانیت کے جوہر ہیں جنہیں آگ اور خون فنا کر دیتی ہے! بظاہر یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور نگاہ فریب دکھائی دیتی ہے اور اس کے خلاف لب کشائی کرنے والے کی شقاوت و قساوت کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تعلیم محض الفاظ و حروف کی دنیا ہی میں خوش آیند معلوم ہوتی ہے یا عملی دنیا میں بھی کارفرما ہو سکتی ہے۔

تورات میں لڑائی کے کھلے کھلے احکام موجود ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ تورات کا بیشتر حصہ بنی اسرائیل کی لڑائیوں کی داستان پر مشتمل ہے (مثلاً دیکھئے کتاب گنتی باب ۳۱) اس لئے یہود کی طرف سے اس فلسفہ کی تائید نہیں ہوسکتی۔ اس کی سب سے بڑی مؤید عیسائیت ہے۔ کیونکہ انجیل میں "دشمن سے بھی پیار کرو"، "بدی کی مدافعت مت کرو!

عیسائیت کا نقطۂ نظر

"ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال آگے کردو!" کی تعلیم ملتی ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے عیسائیت ہی کو لیتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب "شعلۂ مستور" میں حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات شرح وبسط سے بیان کئے ہیں۔ اس میں ہم نے بتایا ہے کہ بزدلی اور دوں ہمتی کی محوّلہ بالا تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم نہ تھی بلکہ اسے سینٹ پال نے اس زمانہ میں وضع کیا جب عیسائی نامساعدتِ حالات سے چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور انہیں ایک انقلاب آفریں جماعت کے پسماندگان کی حیثیت سے سلطنت کا مجرم قرار دیا جا رہا تھا۔ حکومت کی اس دار و گیر سے بچنے کے لئے یہ تعلیم وضع کی گئی اور اس طرح ایک ایسا فلسفۂ زندگی جزوِ مذہب بن گیا جو انسانی حریت وخودداری کے لئے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتا تھا۔ اس فلسفہ نے انسانیت کو کس قدر نقصان پہنچایا اس

خود عیسائیوں کا اعتراف

کی تصریحات خود ان غیر مسلم مؤرخوں اور فلاسفروں کے ہاں شرح وبسط سے موجود ہیں جنہوں نے تاریخ کا مطالعہ غیر جانبدارانہ کیا۔ مشہور جرمن فلاسفر نیٹشے لکھتا ہے۔

> مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ عناصر کا ساتھ دیا ہے' اس نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اس نے بڑے بڑے زبردست دماغوں کا ستیاناس کرکے رکھ دیا ہے۔

(NEITSCHI, BY M.A. MAGAY)

لیکی' تاریخِ اخلاقِ یورپ کی دوسری جلد میں لکھتا ہے۔

> لیکن انکساری اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے اور گو یہ وصف ایک زمانہ تک نہایت موزوں ومناسب رہا۔ تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقی وتمدن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری اور حریت کے جذبات موجود ہوں۔ انکسار وتواضع اس کے دشمن ہیں۔

تہذیب کا مشہور امریکی مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں رقمطراز ہے:۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔ اطمینان کی آرزو باطل اور آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۶)

"دشمن سے بھی پیار کرو!" کا حکم کس قدر ناممکن العمل ہے۔ اس کے متعلق مشہور عالم "اجتماعیات" (W.A. BREND) اپنی کتاب (FOUNDATION OF HUMAN CONFLICTS) میں لکھتا ہے۔

انجیل کا یہ حکم کہ دشمن سے بھی محبت کرو، ایک ایسا مطالبہ ہے جو نفسیاتی طور پر ناممکنات سے ہے۔

یہی کچھ (SAMUEL LOWY) نے اپنی کتاب (MAN AND FELLOW MAN) کے صفحہ ۹ پر لکھا ہے۔ اس باب میں علم "تجزیۂ نفس" کے امام (SIGMEND FRUED) کی رائے بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

ہمسایہ سے پیار کرنے کا حکم ناممکن العمل ہے محبت کی ایسی وسعتیں صرف اس کی قدر و قیمت کو کم کر سکتی ہیں، بُرائی کا علاج نہیں کر سکتیں۔ تہذیب اس قسم کے احکام کی کچھ پروا نہیں کرتی۔ یہ ایک مقدس حکم ہے جسے کہہ تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے لیکن اس پر عمل مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔ (CIVILISATION, WAR AND DEATH: PP. 78-94)

"برائی کی مدافعت نہ کرو!" یہ ایک ایسا حکم ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے دنیا میں شر کی تمام قوتیں بے لگام ہو جاتی ہیں اور جور و استبداد، اور ظلم و ستم، عمرانی اور تمدنی زندگی کے ہر شعبے پر چھا جاتا ہے۔ اسی لئے (BRIFFAULT) عیسائیت کے خلاف یہ سنگین جُرم عائد کرتا ہے کہ اس نے اس غلط تعلیم سے ہمیشہ ظلم و استبداد کا ساتھ دیا ہے اور اس طرح عدل و انصاف کا گلا گھونٹا ہے۔ اس نے اس باب میں سپین کے پروفیسر (DR. FAULTA AND GRACIA) کا ایک اقتباس بھی دیا ہے جو باوجود اپنی طوالت کے اس قابل ہے کہ یہاں نقل کر دیا جائے۔

ڈاکٹر گریشیا لکھتا ہے۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا، یہ اس

کے تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے اور انہیں آئینِ محبت کی تعلیم دی ہے انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہبِ اخلاق کے اس طوفان میں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس، جور و استبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان آسمان سے اُترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو ان کی طرف فارقلیط کا پیغامِ رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہ گاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظامِ عالم کا خاصّہ ہے۔ یہ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بناء پر قائم ہے۔ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنّم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنّم کا قیام ہے، اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں، ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں، وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں، عیسائیت کی روح انہیں جا کر تسلّی دے گی۔ لیکن یہ اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے۔ جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل زبان بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی رُوح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اس کے نزدیک

> ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصوّر۔ وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی۔ لیکن عدل وانصاف کی اسے کبھی یاد نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خودداریوں کا ترک ...... ترسیۂ آرزو ...... عدم مدافعت، خاموش اطاعت۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا۔ غرضیکہ اس قسم کے متشدّد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا۔ لیکن ظلم واستبداد اور جور وستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔
>
> (THE MAKING OF HUMANITY; PP. 322-333)

اس لئے کہ ظلم وستم کی مدافعت ہو سکتی ہے قوّت سے اور قوّت کا استعمال عیسائیت کی تعلیم میں حرام ہے۔ ظالم اور مستبد قوتوں کی گردن مروڑی جا سکتی ہے پنجۂ فولاد سے اور عیسائیت میں فولاد "قیصر" کے حصّہ میں آیا ہے، "خدا" کے حصّہ میں نہیں۔ اس لئے ظلم واستبداد کی تمام قوتیں آزاد ہیں کہ جو جی میں آئے کریں مظلوم ومقہور کے دل میں انتقام کا تصوّر پیدا ہونا بھی گناہ ہے۔ اس کے لئے "آسمان کی بادشاہت" ہے، زمین کی نہیں۔ اسے ان کے مظالم وشدائد پر بھی دشمن سے پیار کرنا ہوگا کہ یہی "اس کے خدا" کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے ماننے والوں کی یہ کیفیت ہو جائے گی تو دنیا میں طاغوت ہی طاغوت کا غلبہ ہوگا۔ چونکہ یہ تعلیم یکسر ناممکن العمل تھی۔ اس لئے اب

مزید اعترافات

خود مسیحیت کے اربابِ بست وکشاد اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ سینٹ پال (لندن) کا ڈین اربابِ کلیسا میں بڑی ممتاز ہستی ہے وہ اپنی کتاب THE FALL OF IDOLS میں PACIFICATION کے عنوان کے ماتحت لکھتا ہے:

> عدم مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گلے کے لئے ناموافق ماحول میں زندگی بسر کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظم سوسائٹی تشدد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنی حدود میں کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہیئے! اور جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کے لئے دشمن کے حملہ کی مدافعت کرنا بھی ضروری ہوگا...... فتنہ وفساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں جو کسی ضابطہ کی پروا ہی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب

ہوتی ہے. اور ایسے جرائم کے انسداد نہ کرنے سے ہم درحقیقت سرکشی کا بھلا کر رہے ہیں۔

عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؟ ایک بڑے پیمانے پر قزاقی. ص۷۹[1]

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف لکھتا ہے :۔

یہ دیکھ لینے کے بعد کہ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں مدافعانہ جنگ ضروری ہو جاتی ہے، ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کے ماتحت یہ یقین کیا جائے کہ اب جنگ ضروری ہو چکی یا نہیں۔ (صفحہ ۱۸۱)

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے. آرک بشپ آف کنٹربری" کلیسائے انگلستان میں عیسائیت کی سب سے بڑی مقتدر ہستی ہے. اس کے متعلق رائٹر کا حسبِ ذیل بیان قابلِ غور ہے :۔

آرک بشپ آف کنٹربری اور یارک کے نزدیک ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں جنگ میں شرکت، عیسائیت کے منافی نہیں ہوگی. (اخبار نیشنل کال۔ مورخہ ۲۲/۱۲/۳۶)

چنانچہ اس جوازِ شرکت کا مظاہرہ دوسری عالمگیر جنگ میں ہمارے سامنے آچکا ہے جس میں بقول (SIR RICHARD GREGORY) کیفیت یہ تھی کہ :۔

جنابِ مسیح کا کلیسا ان ہتھیاروں اور قوتوں کو اپنی برکت دیتا تھا جو جنگ کے لئے تیار کی جاتی تھیں. اگرچہ ہر عیسائی سلطنت جو جنگ میں شریک ہوتی تھی اپنی فتح کے لئے اسی خدا کی مدد مانگتی تھی.

(RELIGION IN SCIENCE AND CIVILISATION; P 274)

ان تصریحات کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عیسائی مشنریوں کا یہ دعویٰ کہ جنگ بہرحال خلافِ تہذیب و خلافِ انسانیت ہے اور عیسائیت کی تعلیم جنگ کے خلاف صدائے احتجاج ہے، کس قدر صداقت پر مبنی ہے؟ عیسائی مشنری اس تعلیم کی تبلیغ کیوں کرتی ہے اس کا جواب عنوان زیرِ نظر کے آخر میں آپ کے

---

[1] بخاری، باب مظالم میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا (یعنی تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم)، صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر مظلوم ہو تو اس کی امداد تو کی جا سکتی ہے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ فرمایا کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے!

سامنے آئے گا۔

ہندو مذہب اور جنگ

ہندو مت، مذہب ہی جنگ و جدال کا ہے۔ تورات کی طرح وید بھی ان لڑائیوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں آریہ غیر آریوں کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے۔ علاوہ ازیں ان کے دیوتاؤں کی لڑائیوں کے قصے بھی ویدوں میں موجود ہیں ۔۔۔ رگوید منڈل ۲، منتر ۲۰، رچا ۶ میں ہے :۔

وہ اندر جس نے ورترا کو قتل کیا اور جس نے قصبے کے قصبے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر دیئے۔ وہ کالے داسوں کی فوج کو تباہ کرتا ہے۔

اور اسی وید کے چوتھے منڈل منتر ۱۶، رچا ۱ میں ہے کہ :۔

اس نے پچاس ہزار سیاہ فام دشمنوں کو لڑائی میں تباہ و غارت کیا۔

ان لڑائیوں کی مزید تفصیل کے لئے مسٹر آر۔ سی۔ دت کی کتاب THE ANCIENT CIVILISATION OF INDIA ملاحظہ فرمایئے ! ویدوں کے بعد ہندو اتہاس (تاریخ) میں شری رام چندر جی اور شری کرشن جی کے نام اوتاروں کی حیثیت سے لئے جاتے ہیں۔ رامائن اور مہابھارت مقدس مذہبی کتابیں تصور کی جاتی ہیں۔ رامائن اس لڑائی کی تفاصیل پر مشتمل ہے جو مہاراج رام چندر نے لنکا کے راجہ راون کے ساتھ لڑی اور "مہابھارت" میں کورو اور پانڈو کی جنگ کا قصہ مذکور ہے۔ کرشن مہاراج کی طرف منسوب کردہ "گیتا" کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ جب جنگ مہابھارت کے سلسلہ میں میدان میں پہنچ کر ارجن شمشیر افگنی سے ہچکچایا کیونکہ اس نے دیکھا کہ میدان میں دونوں طرف ایک ہی دادا کی اولاد ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہے تو کرشن جی نے "فلسفۂ عمل کی تلقین سے اس کے سرد لہو کو گرمایا اور اسے جنگ و پیکار پر اکسایا۔ مہاراج رام چندر اور مہاراج کرشن کے یہی وہ معرکہ آرا کارنامے ہیں جن کی بنا پر انہیں اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ہندو مت کی طرف سے جنگ و قتال کے خلاف لب کشائی ناممکنات میں سے ہے۔ لیکن چونکہ ہندو مت ہر قسم کی متضاد تعلیم کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اس لئے اہمسا (عدم تشدد) کی تعلیم بھی اس مذہب کا جُزو بتائی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں اس کا اس قدر چرچا ہوا ہے کہ اُسے پرمو دھرما (سب سے بلند مذہب) قرار دیا جاتا ہے۔ "اہمسا" کے پرچارک ہندو قوم کے سیاسی راہ نما مہاتما گاندھی[1] ہیں۔ چونکہ

(۱) حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ہنگامی سیاست ہماری کتاب کا موضوع نہیں اس لئے ہمیں ان امیال دعواطف سے بحث نہیں جن کے باعث "اہمسا" کو ہندوستان کی تحریکِ "رام راج" کا سب سے کامیاب حربہ قرار دیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس حربہ کو بطور عقیدہ اور فلسفۂ زندگی کے پیش کیا جاتا ہے اس لئے اس کا ذکر ناگزیر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا خود مہاتما گاندھی کے نزدیک یہ فلسفۂ زندگی کے ہر شعبہ اور تمام حالات میں ممکن العمل ہے۔ یا ان کے نزدیک ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں تشدد ضروری ہو جاتا ہے۔ اہمسا سے مفہوم یہ ہے کہ دشمن سے انتقام نہ لیا جائے۔ برائی کی مدافعت کے لئے کبھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ تشدد پر کسی حالت میں بھی نہ اترا جائے۔

مہاتما گاندھی کا فلسفہ

مہاتما گاندھی کے نزدیک اہمسا ہی صداقت ہے اور اسی لئے وہ قریب بیس پچیس برس سے اس کا متواتر و مسلسل پرچار کر رہے ہیں لیکن ایسے حالات بھی سامنے آجاتے ہیں جن میں خود مہاتما گاندھی کو اہمسا کے اصولوں کے خلاف تلقین کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ۹ اگست ۱۹۴۶ء کے اخبار ہریجن میں لکھا ہے کہ ایک حبشی پادری کی کسی سفید فام (یورپین) نے بے عزتی کی تو اس پادری نے (جو بڑے توانا اور مضبوط جسم کا تھا) اپنے حریف سے کہا کہ "بھائی مجھے معاف کر دو!" اس پر مہاتما گاندھی لکھتے ہیں کہ:-

اور اعتراف

> یہ اہمسا نہیں ہے یہ مسیح کی تعلیم کی تضحیک ہے جوانمردی کا تقاضا تھا کہ وہ پادری اس سفید فام سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتا۔

اسی طرح فسادات کلکتہ کے موقع پر انہوں نے اپنے اسی اخبار کے افتتاحیہ میں لکھا کہ:-

> یہ لوگ بدلہ بھی لے سکتے ہیں اور اس سے مجتنب بھی رہ سکتے ہیں۔ اجتناب آسان اور سادہ ہے بشرطیکہ اس کے لئے عزم موجود ہو۔ بدلہ پیچیدہ ہے (اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بدلے میں) ایک ہی دانت کے بدلے ایک ہی دانت توڑا جاتا ہے یا زیادہ۔
>
> (ہریجن، ۲۵ اگست، ۱۹۴۶ء)

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) یہ ۱۹۴۷ء سے قبل کی تحریر ہے ___ جب ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی تعلیم (عدم تشدد) کا بڑا چرچا تھا۔ اس مقام کو اسی پس منظر کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد خود مہاتما گاندھی کو ایک ہندو نے قتل کر دیا اور جب ہندوستان کو آزادی ملی تو وہ دنیا کی سب سے بڑی جنگجو قوم ثابت ہوئی۔ یعنی اس قوم کے "اوتار" کا فلسفۂ عدم تشدد چار دن تک بھی نہ چل سکا۔

جہاں تک جیوہتیا (جان تلف کرنے کا تعلق ہے مہاتما گاندھی کا عقیدہ تھا کہ سانپ، بچھو، بھیڑیئے اور اسی قسم کے اور جانور جو نوعِ انسانی کے لئے خطرناک ہیں تلف کر دیئے جائیں۔ اس پر کسی نے اعتراض کیا تو انہوں نے ۹ جون ۱۹۴۶ء کے ہریجن کے مقالہ افتتاحیہ میں اس کا جواب دیا جس کے ضمن میں لکھا کہ

> یہ ناممکن ہے کہ انسان تشدد سے اپنی زندگی میں یکسر مجتنب رہ سکے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ امتیازی خط کس مقام پر کھینچا جائے۔ ہر خط ہر شخص کے لئے ایک ہی نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

> اہمسا کی بنا پر جانوروں کو اجازت دے دینا کہ وہ کھیتوں کو کھا جائیں دراں حالیکہ ملک میں قحط پڑا ہوا ہو یقیناً گناہ ہے۔ خیر اور شر اضافی چیزیں ہیں۔ جو چیز ایک قسم کے حالات میں خیر (نیکی) ہے وہی دوسری قسم کے حالات میں شر (بدی) بن سکتی ہے۔

یہاں سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ خود مہاتما گاندھی کے نزدیک اہمسا صداقتِ مطلق (ABSOLUTE TRUTH) نہیں بلکہ اضافی صداقت RELATIVE TRUTH ہے۔ اور ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جب "اہمسا" پر عمل پیرا ہونا موجبِ گناہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہمسا (تشدد) ہی عین نیکی ہو جاتا ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اس کے نزدیک ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جن میں عفو و درگزر ہی نیکی ہوتی ہے اور ایسے بھی ہیں جن میں "عصائے کلیمی" عدل و صداقت قرار دیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں مہاتما گاندھی دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

> بندر جس قدر نقصان پہنچاتے ہیں لوگ اس سے تنگ آجاتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ وہ مر جائیں اگر انہیں کوئی مار دے تو جی میں بہت خوش ہوتے ہیں لیکن بایں ہمہ (ظاہری طور پر) وہ ان کے تلف کئے جانے کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ایک دوست جو شاستروں سے خوب واقف ہے لکھتا ہے کہ بندر فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کی تعداد دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کہئے کہ اس باب میں اہمسا کا کیا حکم ہے۔

اس کے جواب میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔

> میرا اہمسا میرا اپنا ہے۔ میں جانوروں کو تلف نہ کرنے کے عقیدہ کا قائل نہیں ہوں۔ جو جانور انسانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں یا انہیں نقصان پہنچائیں میں ان کی جان بچانے کے لئے اپنے

دل میں کوئی جذبہ نہیں پاتا۔ بلکہ میں ان کی نسل کی افزائش میں مدد دینے کو غلطی سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں چیونٹوں، کیڑے مکوڑوں، کتوں اور بندروں کو خوراک بہم پہنچانے کے خلاف ہوں۔ میں ان کی زندگی بچانے کے لئے انسان کی زندگی قربان نہیں کرسکتا۔ بنابریں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جہاں بندر انسانوں کی بہبود کے خلاف ایک مصیبت بن رہے ہیں انہیں تلف کردینا قابلِ معافی ہی نہیں بلکہ ان کا ماردینا فرض ہے۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہی اصول انسانوں پر بھی کیوں نہ منطبق کیا جائے؟ ایسا نہیں ہوسکتا اس لئے کہ انسان کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں وہ ہمارے ہی جیسے ہیں۔ خدا نے انہیں عقل عطا فرمائی ہے جو جانوروں کو نہیں دی گئی۔ (ہریجن مورخہ ۵ مئی ۱۹۴۶ء)

اس اقتباس کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسان یا انسانوں کی کوئی جماعت

کمزور دلیل

وہی کچھ کرنے لگ جائے جو بھیڑیئے یا بندر کرتے ہیں۔ وہ فصلوں کو تباہ و برباد کردیں، ملک میں فتنہ و فساد برپا کردیں جس سے کسی شریف انسان کی عزت، آبرو، جان، مال، حریت و آزادی، کچھ بھی محفوظ نہ ہو۔ انہیں انسانوں کی طرح دلیل و برہان سے سمجھایا جائے تو اس کا جواب اینٹ اور پتھر سے دیں۔ ان کی عقل و دانش کو اپیل کیا جائے تو وہ سامنے سے تھپیڑ ماریں۔ انہیں انسانیت کا واسطہ دیا جائے تو وہ اس کا مضحکہ اڑائیں اور انسانی جان اور مال، عزت و عصمت کی تباہی و بربادی میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں تو اس وقت کیا کیا جائے؟ کیا یہ کہ چونکہ ان مفسدین کی شکل و صورت انسانوں جیسی ہے۔ اس لئے انہیں ان کی انسانیت سوز حرکات سے زبردستی نہ روکا جائے اور کھلا چھوڑ دیا جائے کہ جو ان کے جی میں آئے کریں۔ کیا اس طرح سے دنیا کا کوئی نظام امن و عافیت قائم رکھ سکتا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ علم و عقل بہت بڑے جوہر ہیں جن سے نوعِ انسانی کو نوازا گیا ہے۔ لیکن کیا یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ نہیں کہ جذبات سے مغلوب ہوکر انسان علم و عقل کے باوجود کس درجہ حیوانیت پر اُتر آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح شراب کے نشہ میں انسان کی عقل مفلوج ہوجاتی ہے اسی طرح جذبات کے نشہ سے بھی عقل اندھی ہوجاتی ہے۔ اور جس طرح ایک شرابی کو (بحالتِ شراب) دلائل و براہین سے قائل کرنا ناممکن ہے، جذبات سے مغلوب انسان کی عقل و بصیرت کو اپیل کرنا بھی بیکار ہے۔ ازمنۂ جہالتُ وحشت کے ڈاکوؤں اور قزاقوں کو چھوڑیئے کہ کہہ دیا جاسکتا ہے کہ ان میں علم و عقل کی کمی تھی۔ دورِ حاضر کی

متمدن و مہذب قومیں جب آئے دن درندوں کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں تو اُن کی عقل و بینش کہاں گم ہو جاتی ہے؟ ابھی کل کا ذکر ہے کہ مسلسل چھ برس تک[1] ان ہی متمدن و مہذب انسانوں نے دنیا کو آگ و خون کا جہنم بنائے رکھا اور کسی صاحبِ عقل و فہم کی کوئی دلیل (REASON) انہیں اس درندگی سے روک نہ سکی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی قلب و دماغ کی تربیت سے اس میں حیوانیت کا عنصر کم کیا جا سکتا ہے (اور قوانینِ الٰہیہ کے اتباع و اطاعت سے مقصود یہی ہے) لیکن جب تک ایسے انسان موجود ہیں جن میں حیوانیت کا عنصر غالب ہے۔ ان انسان نما درندوں کے خونی پنجوں سے انسانیت کو محفوظ رکھنے کے لئے دلائل و براہین (REASON) کے علاوہ ضربِ کلیمی کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جن کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وہ یونہی دیکھنے میں انسان ہیں لیکن حقیقت میں حیوان بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ___ خود یورپ کے مدبرین نے بھی مسئلہ کے اس پہلو پر کافی غور کیا ہے۔ لیکن وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عقلی دلائل سے جنگ نہیں روکی جا سکتی۔ ڈین انگے جس کا تعارف پہلے کرایا جا چکا ہے، اس باب میں رقمطراز ہے:۔

> عام طور پر عصرِ حاضر کا انسان جنگجو نہیں ہے لیکن اس کے اندر غصہ کی آگ نہایت آسانی سے بھڑکائی جا سکتی ہے ___ اگر یہ تشخیص درست ہے تو پھر جنگ کو دلائل و براہین سے ختم کر دینے کے امکانات بہت بعید ہیں۔ (ص ۱۹۳)

اسی ضمن میں (TREATIES ON RIGHT OR WRONG) کا مصنف (H.L. MENCKAM) لکھتا ہے کہ:۔

> ایک قوم کی دوسری قوم کے مدِ مقابل لا کھڑا کرنے کی اس ہیبت سازش کے درمیان وہ نظری مصلحتیں دکھائی دیتی ہیں جو جنگ کو ختم کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ اگر کسی معجزہ سے ان کی آرزو پوری ہو جائے، تو نیشنلزم کا یہ بُت گر جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی بہت سی باطل اور اخلاق سوز اقدار بھی۔ اس لئے کہ اس کی قوتوں کا سرچشمہ خوف ہے اور کوئی شخص ایسے دشمن سے خائف نہیں ہوگا جو عدل کے ہتھیاروں سے مسلح ہو۔ لیکن موجودہ تاریخی عہد کے اختتام سے قبل جنگ کے ختم ہو جانے کے امکانات بہت کم ہیں اور اس میں ابھی صدیاں درکار ہیں۔ انسان ابھی وحشی قبائل سے بہت قریب ہے

---

[1] دوسری جنگِ عظیم مراد ہے۔

اور اس لذت کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں جو اسے اس وقت ملتی ہے جب اس کا خون گرم ہو جائے اور وہ دشمن کے تعاقب میں نکلے یا اس سے نبرد آزما ہو۔ جب مختلف حکومتوں کی طرف سے صلح کے مطالبات پیش ہوتے ہیں تو وہ مطالبات درحقیقت اپنے اپنے مفاد کے مطالبات ہوتے ہیں۔ میں نے بحیثیت ایک صحیفہ نگار کے تین بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے جو جنگ کو ختم کر دینے کے لئے منعقد ہوئیں اور جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے وہ میری اس شرکت کا نتیجہ ہے۔ چند دنوں کی منافقانہ نرمی و آشتی کے بعد یہ مدبرین چھینے اور جھپٹنے پر اُتر آتے تھے اور جب وہ اپنے اپنے ملک میں واپس جاتے تھے تو ان کی کامیابی کو اس معیار سے نہیں پرکھا جاتا تھا کہ وہ دنیا میں قیامِ امن و صلح کے لئے کیا کچھ کر کے آئے ہیں بلکہ اس سے کہ وہ (آئندہ) جنگ کے لئے کیا کچھ (سامان) لے کر آئے ہیں —؟ لیگ آف نیشنز (جمعیتِ اقوام) کا شیرازہ اس دن بکھرنا شروع ہو گیا تھا جب اس کے عزائم بے نقاب ہونے لگے۔ اور یہ چیز اس کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ظہور پذیر ہو گئی تھی۔ ان تمام افسانوی دعاوی کے باوجود جو اس کے قائم کرنے والوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے اس کے قیام سے درحقیقت مقصد یہ تھا کہ جنگِ عظیم کے مالِ غنیمت کو فاتحین کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔ اور جونہی یہ کاروبار شروع ہوا تو یہی فاتحین (مالِ غنیمت کی اس تقسیم پر) باہم گر اُلجھ پڑے۔ (ص ۲۳۳)

اور آگے بڑھیے۔ ۱۹۳۲ء میں لیگ آف نیشنز کی (NATIONAL INSTITUTE OF INTELLECTUAL CO-OPERATION) کے ایما پر پروفیسر آئن سٹائن (EIEN STAN) نے مغرب کے مختلف ممتاز اربابِ فکر و نظر کو دعوت دی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

کیا نوعِ انسانی کو جنگ کی مصیبتوں سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ ہے؟

علم تجزیہ نفس کے مشہور ماہر فرائڈ نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا' وہ اربابِ بصیرت کے لئے قابلِ غور ہے۔

ہر چند یہ بات متضاد سی نظر آئے گی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس غیر منقطع امن کی منزل کا راستہ جسے حاصل کرنے کے ہم اس درجہ متمنی ہیں' خود جنگ کے ذریعہ ہی تیار ہو گا۔ اس لئے کہ جنگ کے ذریعے بڑی بڑی سلطنتوں کا قیام وجود میں آجائے گا جن کی حدود کے اندر

ان کی مرکزی قوت کی وجہ سے جنگ ناممکن ہوجائے گی...... جنگ ختم کرنے کا ایک ہی
یقینی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ باہمی رضامندی سے ایک ایسی مرکزی قوت کو قائم کر دیا جائے
جس کے فیصلے مختلف اقوام کے مفاد کے تصادم کے وقت قولِ فیصل کا حکم رکھیں۔ اس کے لئے
دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اوّلاً اس قسم کی عدالتِ عالیہ کی تخلیق اور دوّم اس کے لئے قوتِ
نافذہ کی بہم رسانی۔ جب تک یہ دوسری چیز بہم نہ پہنچائی جائے اوّل شے بیکار ہوگی۔ بہرحال
جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، سوال یہ نہیں کہ انسان کی غالب قوتوں کو کس طرح دبایا جائے بلکہ
یہ کہ ان کو کس طرح جنگ کی بجائے دیگر شعبوں میں استعمال کیا جائے۔ (ص۹۳-۸۷)

آخر میں ڈاکٹر فرائڈ لکھتا ہے کہ "ہم دماغی کام کرنے والے لوگ اس لئے جنگ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ہماری جسمانی فطرت کا ایسا ہی تقاضا ہے۔"

یہ ان لوگوں کے حالات ہیں جو آج علم و عقل میں اقوامِ عالم کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں اور ہر معاملہ کو دلیل و بُرہان سے طے کرنے کے مدّعی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرکش قوتیں دلیل و برہان سے اپنی غلط روش سے باز آجائیں تو مہاراجہ رام چندر کو راون کے خلاف فوج کشی کی کیا ضرورت تھی اور مہاراجہ کرشن کو کورکھشیتر کے میدان میں اس قدر قتل و خونریزی کی کیا حاجت؟ کیا وہی دلائل جو انہوں نے ارجن کو جنگ کرنے پر آمادہ کرنے میں استعمال کئے تھے کوروں کو جنگ سے محترز رکھنے میں استعمال نہیں کئے جاسکتے تھے؟ لہٰذا دنیا میں جب تک سرکش طبائع کا وجود باقی ہے، انسانیت کو ان کے دندانِ حرص و آز سے محفوظ رکھنے کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اہمسا" کے اوتار مہاتما گاندھی کو بھی بالآخر یہی کہنا پڑا کہ:-

میں تو یہی کہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں یہ محسوس کریں کہ وہ بے بس
ہیں اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے۔ عورتوں میں ریوالور

---

[1] غور کیجئے، عہدِ حاضر کا یہ نفسیاتی عالم کس طرح اسی حل پر پہنچا ہے، جسے قرآنِ کریم نے صدیوں پہلے تجویز کیا تھا۔ قرآنِ کریم دنیا میں امتِ مسلمہ کا وجود اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ شہداء علی النّاس (تمام نوعِ انسانی کے معاملات کے نگہبان) ہوں اور دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکیں اور یہ فریضہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ جب ان کے پاس کتاب اللہ کے ساتھ قوت بھی ہو ـــــ!

اور خنجر رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہو۔
یہی وہ خنجر ہے جس کی اجازت قرآن دیتا ہے۔

(ہر پجن مورخہ ۶ ہو/ ۲۷)
(THOMAS SUGRUE; QOUTED IN "THINK AND GROW RICH-248)

شروع میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مغرب کے تحت الشعور میں وہ کونسا جذبہ اسلام کے خلاف آتشِ خاموش کی طرح کارفرما ہے جس کے ماتحت وہ ہر اسلامی قوت کے ضعف و اضمحلال کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اربابِ کلیسا کے جوش و عساکران کے بیش آہنگ (ہراول دستے) کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ بقول اقبالؒ ؎

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکرِ کلیسا کے سفیر

ناصحینِ مشفق

یہ مسیحی مبلّغ ناصحانِ مشفق کے لباس میں جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ یورپ سے چلتے ہیں تو اپنے اسلحہ ساز کارخانوں کو تاکید کر آتے ہیں کہ دیکھنا! تمہاری بھٹیاں کہیں سرد نہ پڑ جائیں اور سولہ سولہ انچ دھانے کی توپیں، ہزار ہزار پونڈ کے گولے، ٹرپابوس طیارے اور عالم سوز جوہری بم تیار ہوتے جائیں[1] لیکن مشرق میں مسلمانوں کو "مسیح کی منادی" سنائی جاتی ہے کہ خدا کی بادشاہت کمزوروں اور ناتوانوں کا حصہ ہے۔ جو ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کردو۔ کہ آسمانی بادشاہت تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ باقی رہی اس دنیا کی سلطنت اور حکومت تو یہ مٹی ہے۔ اس

---

[1] واضح رہے کہ عیسائیت کی تعلیم کے دوش بدوش یہ جنگی تیاریاں کچھ دورِ حاضر کی پیداوار نہیں ہیں۔ صلیبی جنگ لڑنے والے، اور سارے یورپ کو اس کے لئے مشتعل کرنے والے، یہی اربابِ کلیسا، یعنی ان کے بڑے بڑے بطریق اور اسقف ہی تھے۔ وہ صلیبی جنگ جس کے متعلق خود ایک عیسائی مؤرخ کا بیان ہے۔

"جس رسولِ عربی کی فوجیں یروشلم میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئیں (یعنی بہ عہد حضرت عمرؓ) تو کسی ایک غیر مسلم کو بھی بنا ر بر مذہب قتل نہیں کیا گیا۔ لیکن جب صدیوں بعد صلیبی جنگ لڑنے والے عیسائی اس شہر میں داخل ہوئے تو کوئی مسلمان مرد، عورت، بچہ باقی نہ چھوڑا گیا۔"

لئے مٹی پر نگاہ رکھنا ذلت کی نشانی ہے. تاریخ شاہد ہے کہ یورپ کے پادریوں نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے. وہ مسلم ممالک میں خاص طور پر آتے رہے اور انہیں آسمانی بادشاہت کے خواب اور افسانے سناتے رہے. حتیٰ کہ زمین کی بادشاہت دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی — اور مسلمان — ہاں وہی مسلمان جس کے متعلق اس کے خدا نے کہا تھا:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹/۱۱۱)

بلا شبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور مال بھی اور اس کے عوض انہیں جنت کی زندگی عطا کر دی. یہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، دشمن کو مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں. یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا ہے) تورات انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے. اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو. (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا ہے خوشیاں مناؤ اور یہی ہے جو سب سے بڑی فیروزمندی ہے.

یہی مسلمان تسبیح و مصلے کو مآلِ حیات سمجھ کر، قناعت و توکل کے غلط مفہوم کی افیون کھا کر سو گیا.

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

مغرب کے ان ناصحانِ مشفق کی اس منظم سازش کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی "اسرار رموز" میں ایک نہایت بصیرت افروز تمثیل لکھی ہے. وہ کہتے ہیں کہ جنگل میں ایک شیر رہتا تھا. وہاں کی بھیڑیں جب اس سے تنگ آگئیں تو انہوں نے مل کر مشورہ

بھیڑیں اور شیر

کہا کہ اس کا علاج کیا کیا جائے. جو اُن میں سب سے زیادہ سیاست داں بھیڑ تھی اس نے کہا کہ دیکھو اگر تم تمام بھیڑیں بھی مل جاؤ تب بھی ایک شیر نہیں بن سکتیں. لہٰذا اپنے آپ کو شیر بنانے کا خیال محض وہم ہے، کوشش یہ کرو کہ کسی طرح یہ شیر بھیڑ بن جائے. چنانچہ اس بھیڑ نے ایک تارک الدنیا فقیر کے سے کپڑے پہنے اور نہایت مسکین سی شکل بنا کر شیر کے پاس آ بیٹھی اور اُسے اُپدیش دینا شروع کیا کہ بابا! یہ دنیا چند روزہ ہے، مایا کا جال ہے. یہ خونریزی کی زندگی شریفوں کا کام نہیں. دشمن سے پیار کرو. اپنی خودی کو مارو. اس سے اطمینانِ قلب حاصل ہوگا. یہی زندگی کا مقصد ہے.

اے کہ می نازی بذبحِ گوسفند!
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند!

زندگی را می کند ناپائیدار
جبر و قہر و انتقام و اقتدار

غافل از خود شو اگر فرزانۂ
گر ز خود غافل نۂ دیوانۂ

چشم بند و گوش بند و لب ببند
تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

گوسفند کی یہ خواب آور افسوں سازی کارگر ہوئی اور شیر اس کا چیلہ بن گیا اور گوشت چھوڑ کر گھاس پات پر گذران ہونے لگی. رفتہ رفتہ اس کی قوت و ہیبت، تندی و تیزی، جلال و جبروت مسکینی و عاجزی، کمزوری اور ناتوانی، بزدلی اور دوں ہمتی میں بدل گئی اور حالت یہ ہوگئی کہ :-

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند
ہیبتِ چشمِ شرر افشاں نماند

دل بتدریج از میانِ سینہ رفت
جوہر آئینہ از آئینہ رفت

آں جنونِ کوششِ کامل نماند
آں تقاضائے عمل در دلِ نماند

اقتدار و عزم و استقلال رفت
اختیار و عزت و اقبال رفت

پنجہ ہائے آہنی بے زور شُد
مُردہ شُد دلہا و تنہا گور شُد

صد مرض پیدا شُد از بے ہمتی
بیدلی، کوتہ دلی، دوں فطرتی

شیر بیدار از فسونِ میش خُفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

ہندوستان میں دنیا کے باقی حصوں میں، یہ خیالات مسلمانوں میں کس کس انداز سے پھیلائے گئے اس کے تذکرہ کا یہ موقع نہیں۔ انگریزوں نے جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کو ختم کیا تو اسے اس بات کا اندیشہ پیدا ہوا کہ اس خاکستر سے کہیں پھر زندگی کی چنگاری نہ بھڑک اُٹھے اس کے لئے اس نے اسی نسخہ کو یہاں برتا۔ ادرپادریوں کے غول کے غول ہندوستان آنے شروع ہو گئے۔ انہوں نے آکر سارے ملک میں اپنی تبلیغ کا جال پھیلا دیا اور مسلمانوں میں "صلح و آشتی اور آسمانی بادشاہت" کی تعلیم عام ہونے لگی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مرزا غلام احمد قادیانی تھے جنہوں نے اپنی تحریک کو انگریزوں کا "خود کاشتہ پودا" کہہ کر پکارا ہے۔ انہوں نے (اپنی مزعومہ "وحی" کی سند کے ساتھ) اس قسم کی تعلیم دینی شروع کر دی کہ

اے دوستو! جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

اس منظم پروپیگنڈا کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان جہاد کے معاملہ میں جھینپا جھینپا سا نظر آنے لگا۔ اور جن لوگوں نے اس "نئے نبی" کی نبوت کو تسلیم نہ بھی کیا ان کی بھی کیفیت یہ ہو گئی کہ اس باب میں ان کا رویہ معذرتی (APOLOGETIC ATTITUDE) ہو گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن میں جہاد کی آیتیں نہ ہی ہوتیں تو اچھا تھا۔ چونکہ اس پر ان کا بس نہیں تھا اس لئے انہوں نے ان آیات کی ایسی مضحکہ انگیز تاویلیں شروع کر دیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اس زمانہ کے احکام ہیں جب دنیا ابھی اتنی مہذب نہیں ہوئی تھی۔ وہ

دورِ وحشت و بربریت تھا۔ یہ احکام وقتی تھے۔ اس زمانہ کے عربوں کی جنگجو خصلت کے پیشِ نظر ان چیزوں کی ضرورت لاحق ہوگئی تھی لیکن اب یہ تمام آیات منسوخ ہو چکی ہیں وقس علیٰ ھٰذا۔ یہ سازش کامیاب ہو ہی چلی تھی۔ لیکن قوم کی خوش بختی تھی کہ ان میں اقبالؔ جیسا دیدہ ور پیدا ہوگیا جس نے

پیامِ اقبالؔ

اپنی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی سے راہ گم کردہ مسلمان کی نگاہوں کو پھر سے قرآن کی طرف مرکوز کر دیا اور اس منظم سازش کے نگاہ فریب پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور اعلانیہ کہہ دیا کہ

ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

اس نے ان ناصحینِ مشفق سے پوچھا کہ،

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر!
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے!
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر!

یہ اسی مردِ خود مست و خود آگاہ کا اعجاز ہے کہ آج مسلمان نے پھر سے اس حقیقتِ قرآنی کو بے حجاب دیکھ لیا ہے اور قرآن اور صاحبِ قرآن کی سیرت کے اس حیات آور پہلو کو اپنی قوتِ ایمانی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بُدھ مت اور جین مت

اس میں شبہ نہیں کہ بُدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب نے دنیا میں جیو ہتیا کے خلاف تعلیم دی ہے لیکن سوال یہ ہے

کہ ان مذاہب نے انسانی دنیا کو کون سا تمدن دیا ہے؟ جین مت کے پیرو تاریخ میں کسی مقام پر بھی اُبھرے ہوئے نظر نہیں آتے اور آج ان کا جدا گانہ تشخص بھی معروف نہیں۔ بدھ مت والوں نے مہاراجہ اشوک اور کنشک کی حکومت کے بل بوتے پر کچھ فروغ حاصل کیا۔ لیکن اس کے بعد ہندوؤں کی ایک ہی یورش نے انہیں اس طرح ہندوستان کی چار دیواری سے باہر نکال کھڑا کیا کہ آج انہیں اس ملک میں ایک مسلّمہ اقلیت تک کی بھی حیثیت حاصل نہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ مذاہب اور ان کا فلسفہ یکسر انفرادی زندگی کے لئے "نجات" (مکتی) کا مدعی تھا اجتماعی زندگی سے انہیں کچھ سروکار نہ تھا۔ یہی کیفیت اس زمانہ کی عیسائیت کی تھی جب عدم تشدد پر ان کا ایمان تھا۔ ڈین انگے کے الفاظ ہیں:۔

> عیسائیت ایک خالص مذہبی تحریک تھی انفرادی اور عالمگیر۔[1] (ص ۱۴۱)

یہی کیفیت ہندو مذہب کی ہے۔ چنانچہ خود مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:۔

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس (علیحدگی) کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مثلاً صحت، رسل و رسائل، امورِ خارجہ، سکّے وغیرہ۔ مذہب سے اُسے کچھ واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔[2] (ہریجن، مورخہ ۹/۱۲/۴۶)

لیکن جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے جس میں حکومت اور مذہب دونوں عناصر شامل ہیں۔ کسی حکومت کو دیکھئے۔ اسے قدم قدم پر "جنگ" کی ضرورت پڑتی ہے رجنگ کیا ہے؟

قیامِ حکومت اور قوّت

کسی سے کوئی چیز بجبر منوانا، یعنی قوت کا استعمال۔ آپ غور کیجئے کہ حکومت کو کس طرح ہر روز قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ایک ڈاکو جب امنِ عامہ میں خلل انداز ہوتا ہے تو اس کی گرفتاری کے لئے پولیس متعین کی جاتی ہے۔ ڈاکو اور پولیس میں قوت کا مقابلہ ہوتا ہے جس کی قوت زیادہ ہوتی ہے وہ غالب آجاتا ہے۔ اکثر اوقات ڈاکو اس آویزش

---

[1] عالمگیر کس طرح جب خود اناجیل میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور وہ "بیٹوں کی روٹی کتوں کو ڈالنے" نہیں آئے تھے۔

(۲ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

میں مارا جاتا ہے' اگر زندہ گرفتار ہو جائے تو سب سے پہلے اس کی قوت (اسلحہ وغیرہ) چھینی جاتی ہے۔ عدالت اس کے خلاف مقدمہ چلاتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر اسے سزا دیتی ہے۔ یہ سزا پھر قوت کے روز پر عمل میں آتی ہے اس کا نام قیامِ امن ہے جو ہر منظم حکومت کا اوّلین فریضہ ہے۔ غور کیجئے۔ یہاں قدم قدم پر قوت کا استعمال ہوتا ہے اور اسے نہ کوئی عیسائی راہب معیوب قرار دیتا ہے' نہ ہندو مہاتما۔ امن قائم رکھنے والی حکومت کو دونوں آشیرباد (دُعا) دیتے ہیں۔ لیکن جب ایک ڈاکو کے بجائے کوئی جماعت یا قوم ڈکیتی پر اُتر آئے تو اس کے خلاف چارہ جوئی (یعنی جنگ) کو دحشت و بربریت قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "فلسفہ" کس قدر سطحی اور نگاہ فریب ہے۔ قرآن کریم چونکہ حقائقِ ابدی کا ترجمان ہے اس لئے وہ عمومی جذبات کی رَو میں بہہ کر اس قسم کے سطحی "ضابطۂ اخلاق" کی تلقین نہیں کرتا۔ برائی (EVIL) کی روک تھام دین کا اصل الاصُول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ برائی کی مدافعت بطریقِ احسن کرو!

بُرائی کی مدافعت

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ (۲۳/۹۶)

اے پیغمبرِ اسلام! چاہیئے کہ برائی کی مدافعت احسن طریقہ سے کی جائے۔

وہ تسلیم کرتا ہے کہ ایسی برائیاں بھی ہیں جو ہنگامی طور پر یونہی سرزد ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے ایسی برائیوں کا دفعیہ عقل و دانش کو اپیل کرنے سے ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام "برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنا ہے"۔

وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ (۲۸/۵۴)

مومنین کی جماعت بھلائی کے ذریعے برائی کی مدافعت کرتی ہے اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق عطا فرمایا ہے اسے مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھتی ہے۔

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) یہ اُپدیش مسلمانوں کے اس دعوے کے جواب میں تھا کہ ان کی قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے اس کے برعکس ۱۹۳۸ء میں خود کانگریس کے سیکرٹری (مسٹر کرپلانی) نے ایک مفصل بیان میں کہا تھا کہ کانگریس کا نظام تمام تر گاندھی جی کے فلسفۂ حیات پر مشتمل ہوگا۔ اُس وقت سیاست اور مذہب ایک ہو گیا!

لے THE ELIMINATION OF WRONG
IS THE IRREDUCIBLE MINIMUM OF MORALITY
(BRIFFAULT; MAKING OF HUMANIYY)

وہ کہتا ہے کہ اس طریق عمل سے دشمن بھی دوست بن سکتا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَ السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ (۴۱/۳۴)

(اور یاد رکھو!) بُرائی اور بھلائی کبھی برابر نہیں ہو سکتیں۔ بُرائی کی مدافعت مناسب ترین طریقہ سے کیا کرو۔ اگر تم میں اور برائی کرنے والے میں باہمی رنجش و عداوت بھی ہو تو وہ تمہارے اس طریق عمل سے گویا کہ تمہارا مشفق ترین دوست بن جائے گا۔

لیکن چونکہ وہ انسانی جذبات کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کرتا اسی لئے وہ یہاں پہنچ کر رُک نہیں جاتا بلکہ دوسرے رُخ کو بھی سامنے لاتا ہے اور کہتا ہے کہ بُرائی کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دیدہ و دانستہ سرکشی و طغیانی پر اُتر آتے ہیں، اور ہزار سمجھانے پر بھی ظلم اور زیادتی سے باز نہیں آتے بلکہ نرمی کے برتاؤ سے وہ اس میں اور متشدد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ بُرائی ہے جس کا دفعیہ قوت ہی سے ہو سکتا ہے یہ وہ جُرم ہے جس کی سزا ضروری ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (۴۲/۴۰)

بعض اوقات مجرم کی سزا دینا ضروری ہو جاتا ہے لیکن اسے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ سزا جرم سے زیادہ نہ ہو۔ جس نوعیت کا جرم اس کے مطابق سزا۔

مظلوم کے لئے (یا مظلوم کی حمایت میں) قوت کا استعمال کوئی جُرم نہیں۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲/۴۱)

اور یاد رکھو! جس نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا (یا مدافعت کی) تو اس پر تمہیں کوئی باز پُرس کا حق نہیں۔

قوت کا استعمال اسی وقت جُرم ہے جب اُسے سرکشی اور طغیان، فساد اور عدوان کے لئے استعمال کیا جائے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۴۲/۴۲)

ان لوگوں کے ذمہ جرم عظیم ہے جو دوسروں پر ظلم ڈھاتے اور زمین میں ناحق بغاوت و سرکشی پھیلاتے پھرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔

اسی لئے قرآنِ کریم نے عفو و درگذر کی بھی تلقین کی ہے لیکن وہ اس کے ساتھ، امن و انصاف کے لئے حسبِ ضرورت سزا و عقوبت بھی ضروری سمجھتا ہے اور یہی سزا و عقوبت جب افراد سے آگے بڑھ کر اجتماعی شکل اختیار کرلے تو جنگ کہلاتی ہے۔ اگر یہ چیز انسانیت کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے تو عین خیر، اور اگر ذاتی اغراض کے لئے ہے تو یکسر شر! ؎

زندگی کشت است و حاصل قوت است　　شرح رمزِ حق و باطل قوت است
صلح، شر گردد، چو مقصود است غیر　　گر خدا باشد غرض جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند!　　جنگ باشد قوم را نا ارجمند
ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید　　تیغِ اُو، در سینۂ اُو، آرمید

تیغ بہرِ عزّتِ دین است و بس
مقصدِ اُو حفظِ آئین است و بس

یہی وہ حقیقت ہے جسے نبئ اکرمؐ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا، جب حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ اور انتقام کے لئے لڑتا ہے۔ ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ:۔

وَمَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ
(بخاریؒ)

جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کی بات (خدا کا قانونِ عدل و انصاف) سب سے بلند ہو جائے تو اس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے۔

باب چہارم

جہاد

یونانی مفکرین کے نزدیک کائنات کا تصور سکونی (STATIC) تھا۔ اس تصورِ کائنات کا فطری نتیجہ رواقیت (STOICISM) کا وہ فلسفہ تھا جس نے ترکِ عمل اور فنائے آرزو سے شجرِ انسانیت کی ہر شاخ سے نمِ زندگی کو خشک کر دیا اور اس کے برگ و بار پر افسردگی کی برودت طاری ہو گئی۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہی فلسفہ مختلف شکلوں میں دنیائے فکر و عمل پر مستولی تھا۔ قرآن نے اس مرگ آور نظریۂ زندگی اور تباہ کن فلسفۂ حیات کی تردید کی اور بتلایا کہ کائنات سکونی نہیں بلکہ حرکیاتی ہے۔ اور اس کا ذرّہ ذرّہ زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہے۔ اسی سعی و عمل کا نام ہے جہاد۔

جہاد کے معنی

جہاد کے معنی ہیں محنت اور کوشش (جدّ و جہد)۔ قرآن نے اس کے مقابل قعود (بیٹھے رہنے) کا لفظ استعمال کر کے اس کے صحیح معانی کو واضح کر دیا ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ (۴/۹۵)

تم میں سے جو لوگ معذور نہیں ہیں اور یونہی بیٹھے رہتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے

مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر' باعتبار درجہ کے فضیلت دی ہے (کہ ان کے اعمال دوسرے لوگوں کے اعمال سے فائق ہیں) اور دیسے قرآنی معاشرہ کی خوشگواریوں میں حصہ سب کے لئے ہے (کسی مومن کا عمل نیک ضائع نہیں ہوسکتا لیکن درجہ کے اعتبار سے سب برابر نہیں) اور (اسی لئے) بیٹھے رہنے والوں کے مقابلہ میں جہاد کرنے والوں کو اجرِ عظیم میں بھی اللہ نے فضیلت عطا فرمائی ہے۔

لہٰذا جہاد کے معنی **عمل** کے ہوئے۔ قرآن کو شروع سے لے کر آخر تک دیکھئے ہر جگہ ایمان و عمل کی تاکید نظر آئے گی۔ ایمان سے مقصود ہے تعینِ مقصود۔ اور عمل سے مقصد ہے اس مقصد کے حصول کے لئے جدّوجہد یہ ہے مومن کا جہاد، جس میں چھوٹی سے چھوٹی حرکت سے لے کر بڑی سے بڑی قربانی تک سب شامل ہے۔ اس راہِ سعی دکاوش میں آخری مرحلہ وہ ہے جہاں انسان اپنی جان جیسی متاعِ عزیز ہتھیلی پر رکھ کر باطل کے مقابلہ میں صف آراء ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قتال (جنگ) بھی جہاد کے اندر شامل ہے بلکہ یوں کہئے کہ **جہاد** کا نقطۂ آخریں ہے۔ اس سے واضح ہوگیا کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے) جہاد کے معنی ہر مقام پر جنگ و قتال نہیں۔ مومن کی ساری زندگی **جہاد** ہے اور اسی سے شرفِ انسانیت کا ارتقاء اور انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۲۹/۶)

اور جس (مومن) نے جدّوجُہد کی تو حقیقت یہی ہے کہ وہ جدّوجُہد اپنی ذات کے (فائدہ کے) لئے کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تو تمام دنیا والوں (کے افعال) سے بے نیاز ہے۔

اور اسی سے ان راستوں کا نشان ملتا ہے جو کاروانِ حیات کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ع (۲۹/۶۹)

اور وہ لوگ جو ہماری راہ (حق و صداقت) میں جدّوجُہد کرتے ہیں، تو یہ واقعہ ہے کہ ہم انہیں اپنی راہ (عروج و ارتقاء) کی طرف رہنمائی کر دیتے ہیں اور بلاشبہ اللہ حسن کارانہ زندگی بسر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

یہی مومن کا وسیلہ ہے

یہی خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۵/۳۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (ہر حال میں) اللہ (کے قوانین) کی حفاظت میں رہو! اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ڈھونڈو! یعنی اس کی راہ میں جدّوجُہد کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔

اور اس کے بغیر حصولِ جنّت ناممکن ہے[1]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ یَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (۳/۱۴۱)

اے پیروانِ دعوتِ حق! کیا تم سمجھتے ہو؟ (محض ایمان کا دعویٰ کر کے) جنّت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تو وہ موقع پیش ہی نہیں آیا کہ یہ ظاہر ہو جاتا کہ کون لوگ ہیں جو راہِ حق میں جدّوجُہد کرنے والے ہیں، اور کتنے ہیں جو مشکلات و شدائد میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

اسی سے درجاتِ عظیم ملتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ۝

(۹/۲۰)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ (حق) میں جان و مال سے جدّوجُہد کی تو یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے اور وہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔

یہی لوگ خدا کی رحمتوں کے اُمیدوار ہو سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ

---

[1] اسی لئے حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ان الجنۃ تحت الظلال السیوف "یقیناً جنّت تلواروں کی چھاؤں تلے ہے" (بخاری، کتاب الجہاد) اور ترمذی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دو قطرے خدا کو بہت محبوب ہیں ایک آنسو کا قطرہ جو اس کے خوف میں نکلے اور دوسرا خون کا قطرہ جو اس کی راہ میں بہے۔ ("خوف" سے مراد ہے قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتیجہ کا احساس)۔

أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲/۲۱۸ نیز ۱۶/۱۱۰)

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کر کے (گھروں سے) نکل کھڑے ہوئے اور خدا کی راہ (حق وصداقت) میں جدوجہد کی' تو یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور بلاشبہ قانونِ خداوندی' ہر قسم کی حفاظت اور نشوونما کا ذمہ دار ہے۔

اور فلاح وسعادت کے مستحق۔

لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ ... وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹/۸۸-۸۹)

اللہ کے رسولؐ نے اور انہوں نے جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں' اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (راہِ حق میں) جہاد کیا۔ یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے (نعیم ابدی) کے ایسے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اس لئے یہ باغ کبھی خشک ہونے والے نہیں) یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی فیروزمندی ہے (جو ان کے حصہ میں آئی ہے)۔

مومن کی زندگی

ایک مومن کی زندگی پر غور کیجئے' وہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے کہ خود بھی قوانینِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور ان قوانین کو دنیا میں نافذ کرے۔ وہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اپنے آپ کو اس کے مطابق نہیں ڈھالتا' بلکہ اس کو اپنے نصب العین کے مطابق بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس تبدیلی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک یہ "سب کچھ (جانؔ مالؔ)" مقصود بالذات نہیں۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اور وہ مقصد ہے دنیا میں اقدارِ خداوندی کا نافذ کرنا۔

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ اُو بسازد روزگار

گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

برکند بنیاد موجودات را
می دہد ترکیبِ نَو ، ذرّات را
گردشِ ایّام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوّتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار

یہ انقلاب مومن کی زندگی کا مقصود ہے اور اس کے لئے ہر جدّ وجُہد جہاد ۔ قرآنِ کریم اس حقیقت کو نہایت سادہ اور دل نشین انداز میں بیان کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ مومن اپنی جان اور مال کا مالک نہیں بلکہ امین ہے ۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط .... وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹/۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لئے جنّت کی (زندگی) ہو وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں ۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمّے ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات ، انجیل ، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو ۔ پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا ، خوشیاں مناؤ اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے ۔

یہ وہ تجارت ہے جس میں کوئی خسارہ نہیں ، نقصان نہیں ، فائدہ ہی فائدہ ہے ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۶۱/۱۰-۱۱)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی ! کیا میں تم کو ایسی (نفع بخش) تجارت بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچا لے ، (وہ سوداگری یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھو اور اللہ

کی راہ میں اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ جہاد کرو! (یاد رکھو!) تمہارے لئے یہی بہتر ہے بشرطیکہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

اعلائے کلمۃ الحق کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے اسی لئے اعلائے کلمۃ الحق مومن کی زندگی کا نصب العین ہے اسی کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۧ

(۲۲/۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جدوجہد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں برگزیدگی (شرف و مجد) کے لئے چن لیا ہے۔ تمہارے لئے دین (نظامِ زندگی) میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔ وہی طریقۂ زندگی تمہارا ہو جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا۔ خدا نے تمہارا نام "مسلم" رکھا، پچھلے وقتوں میں بھی اور اس (قرآن) میں بھی۔ اور یہ اس لئے کہ رسول تمہارے اعمال کا نگران ہو' اور تم تمام انسانوں کے اعمال کے نگران ہو۔ پس صلوٰۃ کا نظام قائم کرو! زکوٰۃ کی ادائیگی کا سامان کرو۔ اللہ کا سہارا مضبوط پکڑ لو! وہی تمہارا کارساز ہے' تو کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے' حق و انصاف کی راہ میں مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و کاوش کا وہ فلسفۂ حیات بخش جس میں قوموں کی زندگی کا راز پنہاں ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (۸/۲۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار کا جواب دو! جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں زندگی عطا کرے۔

حیاتِ ابدی "زندگی کی طرف دعوت" کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس فضا کو پیدا کیا جائے جس میں تمہاری انسانیت زندہ رہ سکے۔

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را
نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکامِ اُو نہ گردد
بکامِ خود بگردد ایں زمیں را

اس لئے جب وہ محض سانس لینے کا نام زندگی نہیں رکھتا تو سانس بند ہو جانے کو موت کیسے قرار دے سکتا ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جو اس جدّ و جُہد میں مارا جائے اسے مُردہ مت کہو! وہ زندہ ہے۔ لیکن تم جو زندگی کو محض نفس شماری تک محدود رکھتے ہو' اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (۲/۱۵۴)

اور (اے مسلمانو!) جو شخص خدا کی راہ (حق) میں (جدّ و جُہد کرتا ہوا) مارا گیا اسے مُردہ نہ کہو! بلکہ وہ تو (بہ اعتبارِ نتیجہ و انجام کار) زندہ ہے۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

کہنا تو ایک طرف اپنے وہم و گمان میں بھی نہ لاؤ کہ وہ مُردہ ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ (۳/۱۶۸)

جو لوگ اللہ کی راہ (حق) میں (جدّ و جُہد کرتے ہوئے) قتل ہوتے ہیں' ان کی نسبت ایسا خیال بھی نہ کرنا کہ وہ مر گئے ہیں۔ نہیں! وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور اپنی روزی پا رہے ہیں۔

لہٰذا' قرآن کی رُو سے زندگی حرکت و عمل کا نام ہے۔ جب حرکت و عمل ختم ہو جائے تو اسے موت کہتے ہیں خواہ وہ طبیعی طور پر کتنا ہی عرصہ زندہ کیوں نہ رہے۔ حیاتِ بے شرم کا نام زندگی نہیں۔ اسی میں افراد یا اقوام کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

آپ قوموں کے عروج و زوال کی داستانِ عبرت انگیز پر نگاہ ڈالئے. ایک اصول ہر جگہ اور ہر زمانہ میں

زوال و عروجِ اُمم کا مُحکم اُصول

کارفرما نظر آئے گا. جب تک کسی قوم میں جہد للبقا کا جذبہ اور کارگہ حیات میں آگے بڑھنے کا ولولہ موجود رہا وہ قوم زندہ اور برقرار رہی. لیکن جونہی اس کے قوائے فکر و عمل مضمحل ہو گئے اس کی زندگی کی ہر شاخ پر افسردگی چھا گئی اور اس کے بعد وہ یوں صفحہ ہستی سے مٹ گئی گانّہٗ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا. سطح بین نگاہیں قوموں کی ہلاکت و بربادی کے لئے خارجی اسباب و علل کی تلاش کرتی ہیں، لیکن جو نگاہ سطح سے نیچے اُتر کر تہ تک پہنچتی ہے، وہ دیکھتی ہے کہ یہ خارجی اسباب و علل درحقیقت چیونٹیوں کے اس بے پناہ لشکر کی طرح ہوتے ہیں جو کیڑے کی لاش کو چمٹ کر اُسے اِدھر سے اُدھر لئے پھرتی ہیں. اس قوم کی موت کا حقیقی سبب خود اس کی داخلی قوتوں کا اضمحلال و اختلال ہوتا ہے. ؎

مگر کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن کریم استبدال و استخلاف کے اس غیر متبدّل قانون کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اُس اُمّت کو جسے نوعِ انسانی کی پاسبانی کے لئے منتخب کیا گیا ہے، کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ یاد رکھو! تمہاری بقا کا راز جہاد میں ہے. اگر اس سے گریز کرو گے تو تمہاری جگہ دوسری قومیں لے لیں گی اور تمہاری داستانیں ماضی کے افسانے بن کر رہ جائیں گی.

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْئًا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۹/۳۸-۳۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (آخر) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں. کیا آخرت چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی پر ہی ریجھ گئے ہو؟ (اگر ایسا ہی ہے تو (یاد رکھو!) دنیاوی زندگی کی متاع

تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے' مگر بہت تھوڑی! اگر قدم نہ اٹھاؤ گے تو یاد رکھو وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا' اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لا کھڑا کرے گا (اور تم) اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے (اپنا ہی نقصان کرو گے) اور اللہ نے ہر بات کے لئے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

یہ جو تمہیں باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے تو اسی میں تمہاری زندگی کا راز ہے اس لئے کہ اس سے تمہاری قوتوں کا محاسبہ (STOCK TAKING) ہو جاتا ہے اور تم اندازہ کر سکتے ہو کہ تم میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی کتنی صلاحیت ہے۔

یہ محاسبہ مختلف شکلوں میں ہوگا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ (۲/۱۵۵-۱۵۷)

ہم ایسے مواقع پیدا کریں گے جن میں تمہیں خوف اور بھوک اور نقصانِ جان و مال اور ثمرات کے مراحل سے گزرنا پڑے۔ پس بشارت ہے ان ثابت قدم (مجاہدین) کے لئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو (وہ اس کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف کر رکھا ہے اور ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے سلام و رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو (درحقیقت) ہدایت یافتہ ہیں۔

یہی کچھ اُمم سابقہ کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ تم سنّتہ اللہ (خدا کے قانون) میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

فقط اتنا کہہ دینے سے کہ ہم مسلمان ہیں تم اس اٹل قانون سے بچ نہیں سکتے۔ تمہارے دعوئے ایمان کو پرکھا جائے گا اور اس کی پرکھ اعمال کے ترازو سے ہوگی نہ کہ لفظی شاعری سے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ
لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ (۲۹/۲-۳)

کیا لوگ یہ گمان کئے ہوئے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر کہ ہم تو ایمان لے آئے (بلا ثبوتِ عمل) چھوڑ دیئے جائیں گے (اور ان سے کسی قسم کی پُرسشِ اعمال نہ ہوگی) اور وہ کسی (طرح کی) بھٹی میں سے نہیں گزریں گے۔ اور (یاد رکھو!) فی الواقعہ ہم ان سے پہلی اُمتوں کو بھی (ان کے غلط اعمال کی وجہ سے) مشقتوں میں ڈال چکے ہیں تاکہ اللہ انہیں بتلادے کہ کون (اپنے دعوئے ایمان میں) سچے اور کون جھوٹے ہیں۔

عجمی اثرات سے بہانہ سازیاں

اور اس پرکھ کے لئے جہاد کے میدان سے بڑھ کر صاف اور نکھری ہوئی کسوٹی اور کونسی ہوسکتی ہے؟ سورۂ فتح کے دوسرے رکوع کو دیکھئے کس قدر کھلے الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے اور کس طرح مختلف انداز کی بہانہ سازیوں۔ اور حیلہ جوئیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان آیات میں خطاب اگرچہ اُس زمانہ کے بہانہ سازوں سے کیا گیا ہے لیکن مفہوم کی عمومیت تمام آنے والے بہانہ سازوں اور حیلہ کاروں کو محیط ہے۔ یہ بہانہ سازیاں اور عقلِ خود بیں کی حیلہ جوئی کی دسیسہ کاریاں اس دور میں شروع ہوئیں جب اس زندہ اور زندگی بخش پیغامِ خداوندی کی جگہ، عجمی نکات آفرینیوں اور موشگافیوں نے لے لی اور قوم کے قوائے عملیہ کو یونانی فلسفہ اور ایرانی تصوّف کی برفانی سِلوں نے شل کردیا۔

تصوّفِ عجم

کبھی کہا گیا کہ سب سے بڑا جہاد، نفس کے خلاف جہاد ہے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ خانقاہوں کے تنگ و تاریک گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کی ضربیں لگائی جائیں۔ اور سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ کے وظیفے پڑھے جائیں۔ حالانکہ جس جگہ (جہادِ کبیر) کا ذکر کیا ہے وہیں اس کی تصریح بھی کردی ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ سورۂ فرقان میں ہے:۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○ (۲۵/۵۲)

اے پیغمبرِ اسلام! (آپ کسی حالت میں بھی) ان منکرین (حق) کی اطاعت (و محکومیت) قبول نہ فرمایئے اور قرآن کے مطابق ان سے جہادِ کبیر (یعنی سخت جنگ) کرتے رہیئے۔

دیکھئے اس آیت مقدسہ میں فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ پکار پکار کر کس طرح اس "جہادِ کبیر" کی تفسیر کر رہا ہے۔ یعنی

باطل کی ان قوتوں کے خلاف قرآنی احکام کے مطابق جہاد کرو (جَاهِدْهُمْ بِهٖ) تاکہ ان کے طاغوتی نظام کی جگہ اطاعت فقط نظامِ خداوندی کی باقی رہ جائے۔

اربابِ شریعت کی تقسیم

دوسری طرف اربابِ شریعت نے اِس تقسیمِ عمل کے تصور کو وضع کر دیا کہ جنگ آزمائی جیوش وعساکر (کشتریوں) کے لئے ہے۔ اور ہمارے ذمہ تفقہ فی الدین کا فریضہ ہے، جیسے ہم (برہمنوں کی طرح) مساجد کے ممبروں اور فتاویٰ وارشاد کی مسندوں پر بیٹھ کر سرانجام دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ کریم میں اس قسم کی تقسیم وتفریق کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تقسیم ہندوؤں کی منوسمرتی سے مستعار لی گئی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی پوری کی پوری اُمت کا فریضہ ہے اور قتال (جنگ) بھی ساری اُمت کا فریضہ۔ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کے الگ طبقہ کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔

غُلام اور لَونڈیاں

انسانی تاریخ کیا ہے؟ صید و صیاد کی ایک خونچکاں داستان! یوں تو اس داستان کی ہر کڑی زہرگداز والم انگیز ہے. لیکن ان کا سب سے زیادہ جگر پاش ٹکڑا وہ ہے جسے غلامی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے. غلامی، یعنی انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ. ایک انسان کا دوسرے انسان کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی ملکیت تصوّر کر لینا. اس سے بڑھ کر وجہِ ننگِ انسانیت اور کون سی لعنت ہوسکتی ہے؟ ہم نے لکھا ہے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی ملکیت میں رکھنا غلامی ہے لیکن اس سے بھی غلامی کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی. آپ نے کبھی یہ نہ دیکھا ہوگا کہ بھیڑ بکریوں کا مالک انہیں خونخوار بھیڑیوں کے آگے ڈال دے. لیکن یہ تماشہ آپ کو انسانوں کی دنیا ہی میں نظر آئے گا کہ روما کے ایمپی تھیٹروں میں بھوکے شیروں کو کھُلا چھوڑ کر غلاموں کو اندر دھکیل دیا جاتا تھا' اور سبعیت و درندگی کا یہ انسانیت سوز منظر ان غلاموں کے آقاؤں اور دوسرے تماشائیوں کے لئے تفریح کا ذریعہ بنتا تھا.

اسلام آیا تو اس نے دنیا کے ہر گوشے میں غلاموں کو نظامِ معاشرت کا ایک اہم جُزو دیکھا. یہ انسانی مساوات کا پیامبر اس انسانی ذلّت کو کس طرح باقی رہنے دے سکتا تھا؟ اس نے مستبد انسانوں کو للکارا اور کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ انسان کا دوسرے انسانوں کو اپنی ملکیت سمجھ لینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ تمام انسان، انسان ہونے کی جہت سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں. یہ انسانی شرف و تکریم کے خلاف ہے کہ انسان کو جنس یا مویشی تصوّر کر لیا جائے. آزادی انسان کا شرفِ اوّلین اور اس کا پیدائشی حق ہے. انسانیت کی دنیا میں غلامی باقی نہیں رہ سکتی.

اُس وقت دنیا میں دستور یہ تھا کہ جو لوگ لڑائیوں میں قید ہو کر آتے تھے انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا اور اس

جنگ کے قیدی

کے بعد ان کی اولاد پیدائشی غلام تصور ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے غلامی کے اس سرچشمہ کو بند کر دیا۔ اس نے کہا کہ کوئی جنگی قیدی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ انہیں رہا کیا جائے گا۔ زرِ فدیہ لے کر یا احساناً۔ جیسا بھی تقاضائے وقت ہو۔

فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡہُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ٭ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَہَا ۚ۟ (۴۷/۴)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جب تم (میدانِ جنگ میں) ان لوگوں کے بالمقابل آؤ جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی ہے تو (چاہیئے!) کہ تم ان کی گردنیں مار دو! تا آنکہ انہیں پوری پوری شکست دے دو۔ (یعنی ان کی قوت کو جڑ سے اکھیڑ ڈالو!) پھر ان کو مضبوطی سے باندھ لو! (یعنی گرفتار کر لو!) اس کے بعد یا تو زرِ فدیہ لے کر یا (ان پر) احسان کر کے (یعنی جیسا بھی وقت کا تقاضا ہو) چھوڑ دو۔ تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیاروں کو رکھ دے (یعنی جنگ بند ہو جائے)۔

اور جب تک وہ رہا نہ ہوں، وہ حکومت کے مہمان STATE GUESTS ہوں گے۔ جب سرچشمہ اس طرح بند کر دیا تو اس ندی کو خود بخود خشک ہو جانا تھا، لیکن اس کے لئے خشک ہونے میں وقت ضرور لگنا تھا۔ اس

پہلے کے غلام

لئے جو پانی اس میں پہلے سے موجود تھا اس کی نکاس کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیئے تھی۔ اس زمانہ میں عام طور پر عربوں کے ہاں غلام موجود تھے۔ باہر کا کام کاج کرنے کے لئے غلام اور گھروں کے اندر لونڈیاں، یہ غلام اور لونڈیاں ان کے معاشی اور معاشرتی نظام کا جزو بن چکے تھے ان سب کو یک دم الگ کر دینے سے اس نظام میں خلفشار واقع ہو جاتا۔ مسلمانوں کی خود اپنی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ اس اختلال کا خاطر خواہ انتظام کر سکتے۔ اس قسم کا خلفشار نہ صرف آقاؤں کے لئے وجہ گراں باری ہو جاتا، بلکہ خود آزاد شدہ غلاموں اور لونڈیوں کے لئے بھی مصیبت کا باعث بن جاتا اور پورے کے پورے نظامِ مدنیت کے لئے مشکلات کا موجب اور مفسدات کا سرچشمہ ہو جاتا۔ اس لئے تقاضائے مصلحت یہی تھا کہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو یک لخت الگ نہ کر دیا جائے بلکہ یہ تبدیلی بتدریج پیدا کی جائے۔ تاکہ یہ لوگ آہستہ آہستہ غلامی کی حالت سے نکل کر آزادانہ نظام میں جذب ہوتے جائیں۔ قرآنِ کریم نے ان سابقہ غلاموں کو (یعنی جو پہلے سے موجود تھے) مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ (جو تمہارے قبضہ و تصرف میں ہیں) کے الفاظ سے

تعبیر کیا ہے. غلاموں کے متعلق تمام احکام ان ہی کی بابت ہیں. جب ان احکام کی رُو سے غلاموں کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو غلامی کا وجود از خود مٹ گیا. اس لئے کہ نئے غلام بنائے نہیں جا سکتے تھے اور جو موجود تھے وہ اس طرح رفتہ رفتہ ختم ہوگئے. مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ میں ماضی کا صیغہ ہے. اور قرآنِ کریم میں ہر جگہ ان کے لئے یہی صیغہ (ماضی) آیا ہے. اس سے بھی واضح ہے کہ اس سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اس سے پہلے عربوں کے معاشرے میں موجود تھے.

اب دیکھئے قرآنِ کریم نے اُس وقت کے موجودہ غلاموں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) کی اصلاح اور آزادی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کیں. سب سے پہلے اس نے لوگوں کو ترغیب و تحریص دلائی کہ وہ

تدابیر

غلاموں کو آزاد کرتے رہیں. اس کے لئے اس نے "تحریرِ رقبۃ" (غلاموں کو آزاد کرنے کو) مختلف خطاؤں اور لغزشوں کا کفارہ قرار دیا. مثلاً:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ... (۴/۹۲)

اور (دیکھو) کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے مگر یہ کہ غلطی سے (اور شبہ میں) اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے. اور جس کسی نے ایک مسلمان کو غلطی سے (اور شبہ میں) قتل کر دیا ہو، تو چاہیئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرلے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دے.

بھول چوک سے لغو قسموں کا کفارہ.

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۚ (۵/۸۹)

تمہاری قسموں میں سے جو قسمیں لغو (اور بے معنی) ہوں ان پر خدا تم سے مواخذہ نہیں کرے گا، ان پر کرے گا جنہیں تم نے (سمجھ بوجھ کر) ٹھہرایا ہو تو (اگر کوئی قسم توڑنی پڑے تو) اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے. درمیانی درجہ کا کھانا جیسا تم اپنے بیوی بچوں کو کھلایا کرتے ہو یا (دس مسکینوں کے کھانے کی جگہ) کپڑا پہنا دینا یا ایک غلام آزاد کرنا.

ظہار (غصے کی حالت میں بیوی کو ماں کہہ دینے کی لغویت) کا کفارہ:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ....(۵۸/۳)

اور جنہوں نے ظہار (یعنی غصہ کی حالت میں بیویوں کے لئے "ماں" جیسے الفاظ کو استعمال کیا (اور) پھر کہے ہوئے قول سے پھر گئے (یعنی اس سے رجوع کر لیا) تو (چاہیئے کہ) عورتوں کو چھونے سے پہلے غلام آزاد کر دیا جائے۔

یہ تاوان انہیں کس قدر گراں پڑتا تھا اس کا اندازہ ہم آج نہیں لگا سکتے۔ اس لئے کہ ہم اس کا احساس ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے نزدیک ایک غلام کی قیمت کیا تھی۔ قیمت کے علاوہ ان کی معاشرتی اور معاشی زندگی پر بھی اس کا گہرا اثر پڑتا تھا، کیونکہ غلام ان کے معاشرہ کا جزو بن چکے تھے۔ ان حالات میں، غلام کو آزاد کرنا ان کے لئے بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا۔ اسی لئے قرآن نے اسے "پہاڑ پر چڑھنے" سے تشبیہ دی ہے جس میں قدم قدم پر انسان کی سانس پھول جاتی ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝

(۹۰/۱۱-۱۳)

(مگر ان حقائق کے باوجود) انسان پہاڑ کی چڑھائی پر چڑھنے کے لئے ہمت نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ پہاڑ کی چڑھائی کونسی ہے؟ وہ غلاموں کو (طوقِ غلامی سے) آزاد کرانا ہے۔

مکاتبت

پھر دوسری صورت یہ پیدا کر دی۔ جن غلاموں کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ ان میں ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ اگر آزادانہ انہیں بروئے کار لائیں تو وہ خود اپنے لئے اور ملت کے لئے زیادہ منفعت بخش ثابت ہو سکتے ہیں، تو انہیں اس قسم کی شرائط کے ساتھ (کہ وہ قوم کے لئے یوں باعث منفعت ہوں گے) آزادی کا پروانہ لکھ دیا جائے۔ اور ان کی مناسب مالی امداد بھی کی جائے تاکہ وہ اس سے اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر سکیں۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ

(۲۴/۳۳)

اور جو لوگ تمہارے مملوکوں میں سے مکاتبت کا معاملہ کرنے کے خواہشمند ہوں تو چاہیئے کہ اگر ان میں بھلائی کے آثار پاؤ تو پروانۂ آزادی لکھ دو اور اس مال میں سے جو تم کو اللہ نے دے رکھا ہے ان کو بھی بطور امداد (اعانت) کچھ دے دو!

پھر یہ کہا گیا کہ ان غلاموں اور لونڈیوں کی شادیاں کر دی جائیں۔ تاکہ یہ اپنی آزادانہ عائلی زندگی بسر کر سکیں اور اس طرح ملّت کے اجزائے صالحہ بنتے چلے جائیں۔

وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَ الصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَ اِمَآئِكُمۡ

(۲۴/۳۲)

اور تم میں سے جو غیر شادی شدہ ہیں (چاہیئے کہ) ان کا نکاح کر دو! اور (اسی طرح) جو تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نکاح کے لائق ہوں ان کا بھی نکاح کر دیا کرو۔

یہی نہیں کہ لونڈیوں کی شادی غلاموں سے ہو جائے۔ بلکہ دوسرے لوگ بھی ان سے شادی کریں۔

وَ مَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ فَتَيٰتِكُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ‌ؕ وَ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِيۡمَانِكُمۡ‌ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ‌ۚ (۴/۲۵)

اور تم میں سے جو کوئی اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ مسلمان آزاد عورتوں سے نکاح کرلے تو وہ مومن لونڈی سے نکاح کرلے اور (اس بات میں کوئی ذلّت نہ سمجھو کہ تم نے لونڈی سے نکاح کر لیا ہے۔ بڑی چیز ایمان ہے اور) اللہ تمہارے ایمانوں کا حال بہتر جاننے والا ہے۔ اور تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو (یعنی انسان ہونے کے لحاظ سے سب مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

حسنِ سلوک اور جب تک یہ لوگ تمہارے گھروں میں رہیں ان سے نہایت عمدہ سلوک کیا جائے۔ ایسا ہی حسنِ سلوک جیسا اپنے ماں باپ خویش و اقارب سے کیا جاتا ہے۔

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًـا‌ ؕ وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَـارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۙ (۴/۳۶)

اور (دیکھو!) اللہ کی اطاعت و محکومیت (عبودیت) اختیار کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ! اور چاہیئے کہ ماں باپ کے ساتھ، قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں مسکینوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ خواہ قرابت دار پڑوسی ہوں یا اجنبی ہوں، نیز پاس کے اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں، یا (لونڈی غلام ہونے کی وجہ سے) تمہارے مملوک ہوں یا تمہاری ماتحتی میں کام کرتے ہوں، احسان وسلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو اترانے والے اور ڈینگیں مارنے والے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں کے ہاں دستور تھا کہ وہ اپنی لونڈیوں سے جنسی تعلق قائم کرتے تھے لیکن انہیں بیوی کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ ان لونڈیوں کو، جو کسی وجہ سے ابھی تک آزادی

تمتع حاصل نہیں کر سکیں اور جن سے تم جنسی تعلق قائم رکھتے ہو، بیویوں کی حیثیت دینی چاہیئے۔ اس طرح قرآنِ کریم نے بیک جنبشِ قلم انہیں لونڈی کے پست مقام سے اٹھا کر بیوی کا بلند و متعارف درجہ دے دیا۔ ڈھکے چھپے تعلقات کی بجائے انہیں محل حلال قرار دیا۔ اور اس طرح ان کے تعلقات کی اجنبیت کو متعارف حیثیت دے کر انہیں ان کی زندگی کا برابر کا شریک اور ان کی اولاد کو برابر کی اولاد بنا دیا۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات انہیں محل حلال قرار دیا ہے۔ مثلاً سورۃ انبیاء میں ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۚ (۲۳/۵-۶) نیز (۷۰/۲۹-۳۰)

(فلاح پانے والے کون ہیں؟) وہ، وہ ہیں جو اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر اپنی منکوحہ بیبیوں پر یا اپنی جائز لونڈیوں پر، (جنہیں اب بیویوں کا درجہ دیا جا رہا ہے) ان پر (ایسا کرنے میں) کوئی الزام نہیں۔

غلامی کا خاتمہ اس طرح قرآنِ کریم نے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ یعنی جو غلام اور لونڈیاں اُس وقت عرب معاشرہ میں موجود تھیں ان کا مسئلہ اس طرح حل کر دیا گیا اور آئندہ سے غلامی کا سرچشمہ بند کر دیا۔ قرآنِ کریم کے ان تدبیری احکام سے اب مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم اسلام لے آئے جس میں غلام اور لونڈیاں موجود ہوں، تو اسلامی مملکت کے سامنے یہ ہدایات موجود ہوں جن کی

روشنی میں وہ ان غلاموں کا مسئلہ حل کر سکے۔ قرآنِ کریم نے غلامی کو اس طرح قاطبۃً ختم کر دیا لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تو انہوں نے جہاں قبل از اسلام کی اور قبیحات کو ایک ایک کر کے اپنی معاشرت کا جزو بنا لیا، غلامی جیسی لعنت کا بھی پھر سے اجراء کر لیا اور اس کرّوفر کے ساتھ کہ مسلمانوں کی تاریخ کا شاید ہی کوئی ورق ایسا ملے جس میں حرم سراؤں اور درباروں میں لونڈیاں اور غلام چلتے پھرتے دکھائی نہ دیں۔ ایک ایک سلطان

پھر غلام کہاں سے آگئے؟

کے حرم میں ہزار ہزار لونڈیاں! آپ یقیناً متعجب ہوں گے کہ یہ باتیں روا کیسے رکھی گئیں؟ لیکن اس میں تعجب کی کون سی بات ہے' ان کے پاس روایات کا چور دروازہ ایسا تھا جس کے راستے ہر رہزن متاعِ دین و دانش بے محابا سوسائٹی کے نہاں خانوں میں باریاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ لونڈیوں کے تمتع کے باب میں بھی روایات وضع کی گئیں اور بالعجب کہ ان انسانیت سوز کذوبات اور شرمناک مفتریات کو اس ذاتِ اطہر و اقدسؐ کی طرف منسوب کیا گیا کہ جس کے ضبطِ نفس اور اتقانِ عصمت پر دامنِ مریمؑ قسم اٹھائے۔ لونڈیوں کے متعلق خود "صحاح ستہ" میں ایسی ایسی روایات موجود ہیں کہ جن کے تصور سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ہمیں قطعاً جرأت نہیں ہو سکتی کہ ان روایات کو یہاں درج کر دیا جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جبکہ کفار و مشرکین تک کی مملکتوں میں غلامی اور بردہ فروشی جرم قرار پا چکی ہے، مکہ کی مقدس سرزمین میں لونڈیاں سرِ بازار فروخت ہوتی ہیں[1]۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا۔ اور اس کے باوجود مسلمان منبروں اور پلیٹ فارموں سے گلے پھاڑ پھاڑ کر بڑے فخر و ناز سے اعلان کرتے ہیں کہ غلامی کی لعنت کو دنیا سے ہم نے مٹایا!

وہ تھی قرآن کی تعلیم' اور یہ ہیں روایات کے پھندے میں پھنسے ہوئے مسلمان۔

منزلِ مقصودِ قرآں دیگر است | رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد! | در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد!
از ملوکیت، نگہ گردد، دگر! | عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر!

[1] ۱۹۶۳ء میں اخبارات میں خبر آئی تھی کہ حکومتِ حجاز نے غلامی کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایں ہم غنیمت است!